

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر



اشاعت کا چھہترواں سال

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

اکتوبر 2019ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

"لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ" (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ رُوح الامیں پیدا

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم! اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

(اقبالؒ)

ریاستِ مدینہ
کو چلانے کے قرآنی اُصول

(صفحہ نمبر: 30 پر ملاحظہ فرمائیں)

کنونشن 2019ء

27 اکتوبر بروز اتوار منعقد ہوگا

(اراکین اپنے علاقہ کی بزم سے رابطہ فرمائیں)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن کی روشنی میں اللہ اور انسان کا تعلق

1- اللہ کی ذات کے متعلق ہم ازخود کچھ نہیں جان سکتے انسان زمان و مکان میں مقید محدود علم کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ لامحدود کے علم رکھنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ خدا نے اپنی جن صفات کو قرآن میں بیان کیا ہے' ان سے ہم اس کے متعلق اتنا ہی اندازہ کر سکتے ہیں۔

2- خدا تمام کائنات کا خالق اور اس پر مطلق اختیار رکھتا ہے۔ خدا کی صفاتِ مطلق کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور وہ ہر چیز کے پیمانے ان مطلق صفات کے تحت بناتا ہے۔ قرآن نے صفاتِ خداوندی کا ذکر' الاسماء الحسنیٰ کہہ کر مزید وضاحت کی ہے۔ حسن صحیح صحیح تناسب (Proportion) کا نام ہے۔ اگر کسی شے کا ذرا سا تناسب بھی بگڑ جائے تو اس کا حسن باقی نہیں رہتا۔ الاسماء الحسنیٰ خدا کی ذات کے مختلف پہلو (Facets) ہیں خدا کی ذات موجود فی الخارج ہے اور چونکہ مکمل ترین اور بلند ترین ذات ہے اس لئے اس کے خصائص و صفات بھی مکمل ترین اور بلند ترین ہیں۔

3- قرآن کے بعد وحی کا سلسلہ منقطع ہونے کی وجہ سے صفات و اقدار خداوندی کے علم کا حصول اسی قرآنِ کریم کے ذریعے ہی ممکن ہے' جسے قیامت تک کے لئے نوع انسانی کی ہدایت کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ اللہ کی ہدایت جاننے کے لئے کوئی صورت نہیں۔ لہٰذا اس کی اطاعت کا بھی یہی مفہوم ہے کہ قرآن کریم میں دیئے گئے اقدار و احکام کی اطاعت کی جائے اس کو پکارنے کے معنی بھی یہی ہیں کہ زندگی کے ہر دوراہے پر' اس کی دی ہوئی راہنمائی سے دریافت کیا جائے کہ ہم کس راستہ کو اختیار کریں۔

4- خدا کی ذات میں اس کی صفات مکمل ترین شکل میں جلوہ بار ہوتی ہیں۔ بجز ان صفات کے جن کا تعلق خالصتاً خدا کی لامتناہیت اور لامحدودیت سے ہے' انسانی ذات کی بنیادی صفات خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی ہیں' اس فرق کے ساتھ کہ:

(الف) انسانی ذات کی یہ صفات محدود' سمٹی ہوئی شکل میں ہوتی ہیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 68 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

اکتوبر2019ء

جلد 71 | شمارہ نمبر 10

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: QURANOCRACY	ادارہ	4
پاکستان اور دین اور سیاست (پرویز صاحب کا خصوصی انٹرویو)	حنیف رامے (مرحوم)	6
تشکیل معاشرہ اور قرآنی کردار	ڈاکٹر علی نصیر عباسی	18
ریاستِ مدینہ کو چلانے کے قرآنی اُصول	خواجہ ازہر عباس (کراچی)	30
نوجوانوں کا صفحہ: نخل سینا (نشست نمبر 1)	محمد علی صابر صدیقی	38
بچوں کا صفحہ: توکل کسے کہتے ہیں	ادارہ	44
دوقومی قرآنی نظریہ پر مطالبہ پاکستان (قسط نمبر 31)	ڈاکٹر انعام الحق (اسلام آباد)	46

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ

پاکستان: 550 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے سالانہ

بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

Surah Muhammad (محمّد) - Durus-al-Qur'an: Chapter 6 By G. A. Parwez (Translated by: Mansoor Alam)	62

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)

Phone: 042-35714546

Cell: 0321-4460787

idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions

Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions

IBAN:PK36NBPA0465004073177672

Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

بیا ساقی نوائے مرغِ زار از شاخسار آمد
بہار آمد نگار آمد قرار آمد
کشید ابر بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
صدائے آبشاراں از فرازِ کوہسار آمد
سرت گردم تو ہم قانونِ پیشیں ساز دہ ساقی
کہ خیل نغمہ پردازاں قطار اندر قطار آمد
کنار از زاہداں برگیر وبیباکانہ ساغر کش
پس از مدت ازیں شاخِ کہن بانگ ہزار آمد
بہ مشتاقاں حدیث خواجۂؐ بدر وحنین آور
تصرف ہائے پنہانش بچشمم آشکار آمد
دگر شاخِ خلیلؑ از خونِ ما نم ناک می گردد
ببازارِ محبت نقد ما کامل عیار آمد
سر خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملت ما سازگار آمد
''بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم وطرحِ دیگر اندازیم''

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

QURANOCRACY

دراصل ہمارے ذرائع ابلاغ۔ جیسے کیسے بھی یہ رہے ہیں۔ اس کے کرتا دھرتا قیام پاکستان کی اصل و بنیاد سے اکثر و بیشتر ناواقف رہے ہیں' حامیان تحریک کا سارا زور بھی ایک طرف ہندو کے تعصب' عدم رواداری' مسلم دشمنی اور دوسری طرف مسلمانوں کی معیشتی زبوں حالی' تعلیم میں پسماندگی رہا ہے' اس طرح سے اسے علیحدگی کی ایک مذہبی تحریک کا رنگ دے دیا گیا۔ ماڈرن' بزعم خود روشن خیال' پروگریسو طبقے نے اسے مسلمانوں کی تحریک خودارادیت کا نام دے دیا۔ آیئے ذرا اس پر نگاہ ڈالیں کہ اصل بات کیا تھی۔ آپ دیکھیں گے کہ جس کا سارے فسانے میں کوئی ذکر نہ تھا وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے۔

1940ء میں جب لاہور ریزولیوشن پاس ہوا اور 1940ء سے 1947ء تک ذرا مخالفت میں کھڑے لوگوں کا جائزہ لیا جائے تو بات ذرا نکھر کر سامنے آ جائے گی۔ ہندو کی مخالفت قدرتی بات تھی' بھارت ماتا کی تقسیم گئوہتھیا ہی کی طرح ناقابل قبول تھی اور پھر مغربی طرز جمہوریت میں انہیں مسلمان اقلیت پہ سدا کی حکمرانی کی نوید تھی اور انا کی تسکین بھی کہ جن بیرونی حملہ آوروں نے ہزاروں برس کی تاریخ میں اپنا علیحدہ تشخص برقرار رکھا' چاہے وہ حکمران رہے ہوں یا دوسری قوموں کے ساتھ مشترک محکوم۔ ان کو آخر کار زیر کر سکیں گے۔ انگریز کے لئے اس کی مخالفت بھی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ صدیوں سے ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ملک کو انہوں نے اپنی تنظیمی قابلیت کے بل پہ بظاہر ایک ملک بنایا ان کے جاتے ہی پھر سے تقسیم ہو جائے اور کوئی حصہ مغربی تصور جمہوریت سے مختلف نظام حکومت کو اپنا آئیڈیل قرار دے اور انگریز کو چیلنج کرتا ہوا الگ ملک حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ نڈھال برطانوی سامراج کے لئے یہ بہت بڑی شکست تھی' مگر مقابل میں آہنی ارادوں اور اٹل یقین و ایمان کے حامل ایک قائد کی قیادت میں اس وقت کی دس کروڑ کی ایک متحد قوم سیسہ پلائی دیوار بن چکی تھی۔ قائد کی شخصیت بقول ماؤنٹ بیٹن برف کی ایک سل تھی جس پہ بیرونی دباؤ بے معنی تھا' جس کی ناں کو ہاں میں دنیا کی کوئی طاقت نہیں بدل سکتی تھی۔ مگر مخالفت یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس لڑائی میں ایک اور فریق بھی تھا اور یہ تھے کانگریس اور متحدہ ہندوستان کے وہ حامی مسلمان جو مذہبی جماعتوں کا لیبل ماتھوں پہ سجائے قائد کی مخالفت میں سرگرم تھے' اس کے مغربی لباس' مغربی تعلیم' مغربی رہن سہن کو ہدفِ تنقید بناتے تھے۔ خود کو مذہب کے علمبردار اور دینیات پہ اتھارٹی کہتے تھے' یہ نیشنلسٹ مسلمان ابوالکلام' عبدالغفار' آصف علی' سید محمود' کے روپ میں تھے' یہ احرار کے روپ میں بھی تھے' انصار کی شکل میں بھی اور جماعت اسلامی کے

رنگ میں بھی۔ ان سب کا کہنا تھا کہ ہم سے زیادہ مسلمانوں کا ہمدرد کون ہوسکتا ہے اور اسلام کے تقاضے ہم سے زیادہ کون جانتا ہے۔ سیدھے سادھے مسلمان عوام پہ ان کے تقدس کا رعب بھی تھا مگر ادھر لاکھ مولانا سہی ادھر ایک ہی مردِ مجاہد' ایک قلندر:

فقیہہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا

وہ کہتے تھے متحدہ ہندوستان میں کانگریس ہمیں مذہبی شعائر کی' رسومات کی' نماز' روزے کی' زکوٰۃ و حج کی' نکاح و طلاق کے نجی معاملات کی ضمانت دیتی ہے ہمیں اور کیا چاہیئے۔ غور کیجئے تو اس طرح سے ان کی چودھراہٹ ہی نہیں معاملات پہ خصوصی گرفت کو دوام حاصل ہوتا۔ دوسری طرف قائداعظم تھے جو ہر موقعہ پر قرآن پاک کی بالادستی کے علمبردار تھے۔ مولانا حضرات کی طرح اتھارٹی ہونے کے دعویدار نہ تھے' خود 1947ء میں حیدرآباد عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کے سوال کے جواب میں اعتراف کیا کہ ''میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملانہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلام کو سمجھنے کی اپنے طور پر کوشش کی ہے' اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔۔''

اور اس مطالعے اور غور و فکر نے اس غیر معمولی ذہین شخص کو کیا بصیرت بخش دی' کن دوٹوک لفظوں میں اسلامی حکومت کی امتیازی خصوصیت پیش کی۔ فرمایا ''اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی' قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں' اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے''۔ اور یہ کہہ کر قیام پاکستان کا جواز دیا کہ ''حکمرانی کے لئے لامحالہ آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے''۔ قائداعظمؒ جیت گئے' پاکستان بن گیا۔ مخالف اسے تسلیم کرنے پہ مجبور تو ہوئے مگر اندر ہی اندر چوٹ کھائے سانپ کی طرح پیچ و تاب کھاتے رہے' انگلستان کی پارلیمان میں آواز سنی گئی کہ یہ تقسیم عارضی ہوگی اور سیکولرازم کے دعویدار نہرو نے بھی کہا کہ ہم معاشری طور پر یا دوسرے طریقوں سے پاکستان کو مجبور کردیں گے کہ وہ گھٹنوں کے بل آکر ہم سے درخواست کرے۔۔۔ اور مذہب کے یہ علمبردار بھی جوق در جوق اسی ملک میں پناہ گیر ہوئے جسے وہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت کا درجہ دیتے تھے۔ اور پھر مسلسل و متواتر ہر حکومت کو گردن زدنی قرار دیتے رہے کہ وہ یہاں پہ شریعت نافذ نہیں کرتی۔ مطلب یہ کہ اقتدار ہمیں دو کہ ہم ہی یہ کام کرسکتے ہیں۔ یعنی تھیاکریسی مذہبی پیشوائیت کی حکومت..... اور فرقوں میں بٹی اس مذہبی پیشوائیت کو ایک ڈکٹیٹر نے اپنی حکومت کو قائم رکھنے کے لئے ڈھیل دی' مراعات دیں' کسی حد تک شریک اقتدار کیا تو ملک فرقہ بازی اور انتشار اور باہمی جدال و قتال کا شکار ہوکر رہ گیا' امن و امان' چین سکون ملک سے رخصت ہوگئے۔ یہ لوگ اب بھی یہی راگ الاپ رہے ہیں' ضرورت ہے کہ ہم قائداعظم کے خیالات کو' ان کی تقاریر کو اپنے سامنے رکھیں وہ نہ تھیاکریسی کے حق میں تھے نہ ہی مغربی سیکولریت کے' وہ قرآنی مملکت کے داعی تھے۔

مرحوم ڈاکٹر سید عبدالودود نے اس نظام حکومت کے لئے ایک نیا لفظ لغت کو دیا تھا' ضرورت ہے کہ اسے دہرایا جائے کہ وہ قاطع ہے ہر طاغوتی نظام کا۔ خواہ وہ شہنشاہیت ہو (ملوکیت) کمیونزم ہو یا مغربی پارلیمانی جمہوریت۔ اور وہ لفظ ہے قرآنوکریسی (Quranocracy)۔ قرآن میں دیئے گئے تصورات (معاشی' معاشرتی' معیشی' سیاسی) کی روشنی میں' اس کی ابدی اقدار کی پابند حکومت کہ اسی میں انسانیت کی فلاح ہے۔

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پاکستان اور دین اور سیاست

حنیف رامے (مرحوم) نے پرویزؔ صاحب سے ایک خصوصی انٹرویو لیا تھا جس کی روئیداد انہوں نے اپنے جریدہ ماہنامہ نصرت لاہور میں شائع کرنے کے لئے مرتب کی تھی۔ آج مکرّر اس انٹرویو کو قارئین طلوع اسلام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ (طلوع اسلام)

حنیف: اگر کسی کو یہ یادگار نعرہ بھول نہیں گیا کہ پاکستان کا مطلب کیا: ''لا الٰہ الا اللہ'' تو وہ شاید انکار نہ کر سکے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا تھا۔ لیکن پچھلے سترہ سال میں کئی مرتبہ یہ کوشش ہوئی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس حقیقت پر پردہ ڈال دیا جائے۔ کبھی کسی بڑے مصنف نے حکم لگایا کہ تحریک پاکستان میں اسلام کا نام محض عوام کو ساتھ ملانے کے لئے لیا گیا تھا۔ ورنہ اصل مقصد تو مسلمانوں کا معاشرتی، معاشی اور ثقافتی تحفظ تھا جو ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے خطرے میں پڑ گیا تھا۔ کبھی کسی بڑے وکیل نے ثبوت مہیا کیا کہ اسلام پر عمل پیرا ہونا ممکن ہی نہیں کیونکہ مسلمانوں کے متعدد فرقوں میں اسلامی قوانین کے تعین پر شدید اختلاف پایا جاتا ہے، جو ایک کے نزدیک معروف ہے وہ دوسرے کے لئے منکر ہے۔ اس طرح ہم میں اندر ہی اندر ایک منافقت پرورش پاتی رہی جس کے تحت ہم نہ تو اسلام کا نام لینا چھوڑ سکے اور نہ ہم نے اس کی روشنی میں اپنی سیاسی، معاشرتی اور معاشی راہیں تراشنے کی سبیل کی۔ پھر ایک دن آیا کہ ملک کے نام سے اسلامیہ کا لفظ اڑ گیا۔ منافقانہ اسلامیت سے یہ علانیہ غیر اسلامیت بہتر تھی۔ لیکن جن عوام کو ساتھ ملانے کے لئے خواص نے ایک مرتبہ اسلام کا نام لیا تھا وہ ابھی اس واقعے کو نہ بھولے تھے بلکہ برسوں کی سیاسی یبوست، معاشرتی ہلچل اور معاشی استحصال کو وہ اسی امید پر برداشت کرتے آئے تھے کہ کبھی تو اس مملکت خداداد پر اس قانون کی حکومت کے دن آئیں گے جس کا اسوہ نبی کریم ﷺ نے قائم کیا تھا۔ انہوں نے ضد کی اور اسلامیہ کا لفظ اس ملک کے نام میں دوبارہ شامل ہو گیا۔

اب پچھلے دنوں ہم نے ایک انقلاب آتے دیکھا۔ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ ایک طرف تو آفاق پر دشمن کی یلغار تھی اور دوسری جانب انفس میں خدا جاگ رہا تھا۔ وہ خدا جو نیٹشے کے الفاظ میں مر چکا تھا، ہمارے دل و دماغ کے گرد بادوں سے ابھر کر اس طرح ہماری آنکھوں کے سامنے آیا کہ ہم نے اور ہمارے لشکروں نے باقاعدہ خدائے ذوالجلال کے زیر کمان اپنے غنیم سے ٹکر لی اور جرأت و جوان مردی کے تازہ و تابندہ باب لکھے۔

آج یہ حالت ہے کہ ہمارے اندھوں کو بھی انسانی معاملات میں خدا کی کارفرمائی کا یقین آ چکا ہے۔ آج یہ حالت ہے کہ

قیام پاکستان کے وقت ایک لمحے کو خوابِ خرگوش سے بیدار ہونے والی قوم ایک مرتبہ پھر چونک کر کروٹ بدل چکی ہے۔ اگر ہم نے اس لمحۂ بصیرت کو پہلے کی طرح ضائع کر دیا تو یہ اپنے ساتھ ظلم ہوگا۔

قرآن عظیم کے ایک ورق گردان کے طور پر میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اسلام کی تعلیم سیاست، معاشرت اور معیشت کے نئے تقاضوں سے عہدہ برا ہونے سے ایسی ہی قاصر ہے کہ اس پر ہمارا ایمان جمتا ہی نہیں اور ہم کبھی اس در پر اور اس در پر، کبھی اس چیز کی اور کبھی اس چیز کی بھیک مانگتے پائے جاتے ہیں؟ اور کیا قرآن کے بے بدل الفاظ، پُر وسعت معانی، اسکے محکمات و متشابہات اس امر کی کفایت نہیں کرتے کہ ہمیں بنیادی باتوں پر متفق کر کے ہمارے لئے خدا کی وحدت آفرین رسی اور عروۃ الوثقیٰ بن جائیں۔ وہ علامات بن جائیں جو زمین پر خدا کے بندوں کو امید سے ہم کنار رکھتی ہیں۔

پرویز: حنیف صاحب! آپ نے جو سوال اٹھایا ہے وہ بڑا اہم ہے اور تفصیلی جواب کا متقاضی۔ اس کا تعلق کسی ہنگامی تحریک یا دورِ حاضر کے تقاضوں سے نہیں۔ اس کا تعلق ہماری ہزار سالہ تاریخ سے ہے۔ ہمارے قرن اول میں جب اسلام کا لفظ بولا جاتا تھا تو ہر ایک کے ذہن میں اس کا ایک ہی تصور ہوتا تھا اور عملی زندگی میں اس سے ایک ہی مفہوم لیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام مسلمان ایک امت تھے۔ ان کا ایک نظام تھا۔ سب کے لئے ایک قانون تھا۔ اس کے بعد جب (بدقسمتی سے) ہماری گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی تو امت کی وحدت ختم ہوگئی۔ اس میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے (حالانکہ فرقہ بندی کو قرآن کریم نے بالفاظ صریح شرک قرار دیا ہے) ہر فرقے نے اپنی فقہ الگ مرتب کر لی۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ تمام مسلمانوں کے لئے ایک قانون مرتب ہونا ناممکن تھا۔۔ یعنی ایک ایسا ضابطۂ قوانین جس کا اطلاق تمام فرقوں کے مسلمانوں پر یکساں ہو۔ اس مشکل کے حل کے لئے سوچا یہ گیا کہ سیاست کو مذہب سے الگ کر لیا جائے (یعنی فرقہ بندی کے شرک کی پیدا کردہ خرابی کے حل کے لئے ایسا علاج سوچا گیا جو اسلام کے نقطۂ نگاہ سے صریح کفر ہے)۔ سیاست سے متعلق قوانین ارباب حکومت کے سپرد کر دیئے گئے اور پرسنل لاز (شخصی قوانین) ارباب مذہب کی تفویض میں دے دیئے گئے اور ہر فرقے کو اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق اپنے شخصی معاملات (نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ سے متعلق معاملات) کے فیصلے کر لیا کریں۔ اس سے ارباب حکومت بھی خوش ہو گئے کہ ان پر کسی قسم کا کنٹرول نہ رہا اور ارباب مذہب بھی راضی کہ ایک دائرے کے اندر ان کا اقتدار قائم رہا۔ نقصان صرف اتنا ہوا کہ اس سے وہ اسلام باقی نہ رہا جو نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں تھا۔ ہر ایک کا ''اسلام'' الگ الگ ہو گیا۔ ذرا سے غور کرنے پر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ انسانی ہیئت اجتماعیہ کی یہ وہی شکل ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں سیکولر فارم (Secular Form) کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اسلام کی اس شکل کو صحیح تسلیم کر لیا جائے اور اسے بعینہٖ قائم رکھنے کے مطالبے کو اقامت دین قرار دے دیا جائے تو پھر ان اعتراضات کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا جن کی طرف آپ نے اپنے سوال میں اشارہ کیا ہے۔ اس صورت میں پاکستان کے لئے فی الواقعہ کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو سکے۔

لیکن ان اعتراضات کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ ان میں مروجہ اسلام کو حقیقی اسلام تصور کر لیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ

جو اعتراضات موجودہ (غیر اسلام) اسلام کے خلاف ہونے چاہئیں وہ (حقیقی) اسلام پر عائد کر دیئے گئے ہیں۔ ایک عامی کی طرف سے اس قسم کی غلط نگہی کا مظاہرہ قابل فہم ہوسکتا ہے لیکن جب اس قسم کی باتیں قوم کے دانشمند طبقے کی طرف سے سامنے آئیں تو اس سے افسوس ہی نہیں' صدمہ ہوتا ہے۔ جب علامہ اقبالؒ نے (۱۹۳۰ء میں) پاکستان کا تصور پیش کیا تھا تو انہوں نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا تھا:

مسلم مملکت کا میرا یہ مطالبہ ہندوستان اور اسلام دونوں کے لئے منفعت بخش ہوگا۔ ہندوستان کو اس سے اس حقیقی امن اور سلامتی کی ضمانت مل جائے گی جو قوتوں کے توازن کا فطری نتیجہ ہوگی۔ اور اسلام کو اس سے ایسا موقع میسر آ جائے گا جس سے یہ اس ٹھپے کو مٹا سکے جو عرب ملوکیت نے اس پر زبردستی لگا رکھا ہے اور یہ اس قابل ہو سکے گا کہ یہ اپنے قوانین' تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے اور انہیں عصر حاضر کی روح کے قریب تر آنے کے قابل بنا سکے۔

ہمارا مروجہ اسلام وہی ہے جس پر عرب ملوکیت کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔ لہٰذا پاکستان کی تشکیل سے مقصود یہ تھا کہ اس میں مروجہ اسلام کی جگہ نبی اکرم ﷺ کے عطا فرمودہ اور عملاً قائم کردہ اسلام کو از سر نو زندگی اور حرکت عطا کی جا سکے۔ سطح بیں نگاہوں اور تقلیدی جمود میں جکڑے ہوئے قلوب و اذہان کے لئے یہ سمجھنا واقعی مشکل ہے کہ مروجہ اسلام کی خاردار وادیوں سے نکل کر صحیح اسلام کی طرف آنا کیسے ممکن ہے' لیکن جو حضرات اس سطح سے بلند ہو کر دیکھتے ہیں ان کے سامنے کوئی دقت نہیں رہتی۔ سابقہ اقوام کے زمانے میں ایسے وقت میں خدا کی طرف سے ایک نیا نبی آ جایا کرتا تھا جو خدا کی طرف سے عطا کردہ دین خالص میں ملے ہوئے انسانی نظریات و تصورات کو الگ کر کے' دین خالص کو پھر سے قوم کے سامنے لے آتا تھا۔ لیکن ختم نبوت کے بعد خدا کی طرف سے اس کا انتظام یہ ہوا کہ اس نے اپنی کتاب (قرآن کریم) کو' جس میں دین خالص اپنی حقیقی منزہ اور مکمل شکل میں دیا گیا ہے' محفوظ کر دیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔ چنانچہ یہ کتاب اپنی اصلی اور غیر محرف شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ خالص اسلام کو پھر سے نظام حیات بنانے سے مقصود یہ ہے کہ ہم اپنی حیات اجتماعیہ کو قرآن کریم میں عطا کردہ خطوط پر متشکل کر لیں۔ قرآن کریم پر تمام مسلمانوں کا ایمان ہے یہی ان سب میں قدر مشترک ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس لئے اگر خدا کی اس کتاب عظیم کو اساس تسلیم کر لیا جائے تو امت میں پھر سے وہی وحدت پیدا ہو سکتی ہے جو عہد نبی اکرم ﷺ میں وجہ سرفرازی انسانیت تھی۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں کہا تھا کہ مسلمانوں کو موجودہ الجھاؤ سے نکالنے کے لئے ایک ایسے جرأت مند قلب کی ضرورت ہے جو عمرؓ کی روح کو لئے ہوئے اٹھے اور اس کا اعلان کر دے کہ:

حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ۔ ترجمہ: ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

یہی تھا وہ اجمال جس کی تفصیل قائداعظمؒ نے (1941ء میں عثمانیہ یونیورسٹی' حیدرآباد دکن کے طلباء کے ایک سوال کے جواب میں) ان الفاظ میں بیان کی تھی کہ:

''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے

جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارے کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کر سکتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے..... اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب سے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطے سے باہر ہو۔''

قرآن کریم کی تعلیم کا انداز یہ ہے کہ اس میں (بجز چند احکام کے جن کا تعلق بیشتر انسان کی عائلی زندگی سے ہے) زندگی کے مختلف تقاضوں کے متعلق اصول دیئے گئے ہیں اور امت مسلمہ سے کہا گیا ہے کہ وہ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے پیش آمدہ امور کے لئے اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں، باہمی مشاورت سے، جزئی قوانین خود مرتب کریں۔ یہ اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کی روشنی میں مرتب کردہ قوانین بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ بدلتے جائیں گے۔ اس طرح اس امت کا نظام خدا کی طرف سے عطا کردہ مستقل اقدار کا دامن پکڑے ہوئے نہ صرف زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیتا ہوا بلکہ ان کی امامت کرتا ہوا آگے بڑھتا جائے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے اپنے مخصوص بلیغ انداز میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

''اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیات کلی کی روحانی اساس ازلی و ابدی ہے۔ لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقت مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہوگا اس کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں..... لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے کے اندر تغیر کا امکان ہی نہیں..... تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد بن کر رہ جائے گی۔''

قرآن کریم کا یہ انداز اس طریق کے عین مطابق ہے جسے آج کل سائنٹیفک طریق کہا جاتا ہے۔ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ سائنٹسٹ تجرباتی طریق سے قوانین مرتب کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ نہیں۔ سائنٹسٹ قوانین فطرت مرتب نہیں کرتے، فطرت کے قوانین کو دریافت کرتے ہیں۔ ان قوانین کے متعلق، جنہیں اساسی قوانین (Axioms) کہا جاتا ہے۔ سائنٹسٹ یہ بتا ہی نہیں سکتے کہ وہ کس طرح دریافت ہوئے تھے۔ سائنس ان قوانین کو بطور حقیقت ثابتہ تسلیم کر کے انہیں اپنی تحقیق کی بنیاد قرار دیتی ہے اور اس تحقیق کے نتائج کو پیش آمدہ حالات پر منطبق کرتی ہے۔ سائنس کا تعلق خارجی کائنات سے ہے اور دین کا تعلق انسان کی ہیئت اجتماعیہ سے۔ جن قوانین کو سائنس کی دنیا میں (Axioms) کہا جاتا ہے دین کے نظام میں وہ مستقل اقدار یا وحی کے عطا کردہ اساسی اصول کہلاتے ہیں۔ یہ اصول غیر متبدل رہتے ہیں اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ جزئیات زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہیں۔ یہ تھا اسلام کا وہ بنیادی تصور جس کو عملی پیکر عطا کرنے کے

لئے پاکستان وجود میں لایا گیا تھا۔

تشکیل پاکستان کے بعد سے میری یہی کوشش رہی کہ مملکت کے دستور میں یہ شق رکھی جائے کہ مملکت کے قوانین کی بنیاد قرآن کریم ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس اصول کو تسلیم کر لینے سے ایک طرف حکومت کا سیکولر انداز بھی ختم ہو جاتا تھا اور دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کا وہ اقتدار بھی باقی نہ رہتا تھا جو اسے شخصی قوانین کے دائرے میں اس وقت حاصل ہے۔ اس لئے میری دعوت کی مخالفت دونوں طرف سے ہوئی۔ سیکولر نظام کے حامی تو کھل کر سامنے نہیں آ سکتے تھے لیکن مذہبی پیشوائیت کے لئے میدان وسیع تھا۔ مذہبی پیشواؤں نے یہ تو نہیں کہا (نہ ہی وہ ایسا کہنے کی جرأت اپنے اندر پاتے تھے) کہ قرآن کی آمد سے ان کی تھیا کریسی ختم ہو جاتی ہے اس لئے وہ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ انہوں نے عوام کے نازک جذبات کا سہارا لے کر یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ یہ انکار سنت ہے' یہ (معاذ اللہ) انکار رسالت ہے۔ میں اس مقام پر اقرار و انکار سنت کی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ وہ ہمارے پیش نظر موضوع سے متعلق نہیں' لیکن اتنی بات تو حنیف صاحب! بادنیٰ تدبر واضح ہو جائے گی کہ ان حضرات کے نزدیک اسلام کا یہی نقشہ تھا کہ مملکت میں پبلک لاز الگ ہوں اور پرسنل لاز الگ۔ پبلک لاز حکومت کے زیر اقتدار ہوں اور پرسنل لاز مذہب کے دائرے میں۔۔۔ اور پھر پرسنل لاز میں ہر فرقے کا مسلک الگ الگ ہو اور اس طرح امت کے تفرقے کو مستقل سند حاصل رہے۔ اسلام کا یہی نقشہ ان حضرات کے نزدیک عین مطابق سنت ہے اور یہ نقشہ کہ قوانین میں کسی قسم کی تفریق نہ ہو' سب کا سرچشمہ خدا کی کتاب ہو اور یہ قوانین تمام مسلمانوں پر یکساں منطبق ہوں تا کہ امت کا تفرقہ اور انتشار ختم ہو کر اس میں پھر سے وحدت پیدا ہو جائے ان کے نزدیک خلاف سنت ہے' اور اس کا نام انکار رسالت ہے۔ فرمایئے کہ اس کا کیا جواب دیا جائے!

بہرحال ان مخالفتوں کے علی الرغم میں نے اپنی یہ کوشش جاری رکھی کہ ہمارے ہاں یہ اصول آئینی طور پر تسلیم کر لیا جائے کہ ہمارے قوانین کی بنیاد قرآن کریم پر ہوگی جو تمام فرقوں کے مسلمانوں میں قدر مشترک ہے۔ جب ۱۹۶۲ء کے آئین کی ترتیب کا سوال زیر غور تھا تو حکومت کی طرف سے ایک سوال نامہ جاری کیا گیا تھا۔ میں نے اس سوالنامے کے جواب میں اس بنیادی نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے اس اصول پر خاص زور دیا تھا۔ لیکن جب آئین مرتب ہو کر سامنے آیا تو اس میں ''قرآن'' کی بجائے ''اسلام'' کا لفظ لکھا تھا۔ تھیا کریسی کے حامیوں نے اسے بعد میں ''کتاب وسنت'' کے الفاظ سے بدلوا لیا۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے۔

جس منافقت کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے وہ اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ سیکولر نظام حکومت کے حامی دل میں اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ''اسلام'' ہو یا ''کتاب وسنت'' اس سے قیامت تک کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور سے ہو سکے۔ (اس لئے کہ ''اسلام'' کی طرح ''سنت'' کا مفہوم بھی ہر فرقے میں الگ الگ ہے۔ اس اختلاف کا نتیجہ ہے کہ اتباع سنت کے مدعی حضرات آج تک یہ طے نہیں کر سکے کہ نماز میں اونچی آواز سے آمین کہنا مطابق سنت ہے یا خفی آواز سے۔ اس سے آپ اندازہ فرمالیجئے کہ اس مسلک کی رو سے کبھی یہ ممکن ہے کہ ایک ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کیا جا سکے جو ان تمام حضرات کے نزدیک یکساں طور پر قابل تسلیم ہو؟) لہٰذا یہ طبقہ مطمئن ہے کہ نہ اسلامی قوانین مرتب

ہوں گے نہ مملکت اسلامی بنے گی۔ دوسری طرف مذہبی پیشوائیت بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ اس طرح ایسا ضابطۂ قوانین تا حشر مرتب نہیں ہوسکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک ''اسلامی'' کہلا سکے۔ اس لئے ان کی فرقہ بندی اور پرسنل لاز کے دائرے میں ان کا اقتدار بدستور قائم رہے گا۔ اس سے دونوں گروہ بخوبی واقف ہیں۔ لیکن سیکولر انداز کا حامی گروہ یہ کہہ چھوڑتا ہے کہ فرقوں کا اختلاف قانون سازی کی راہ میں حائل ہے اور مذہبی پیشوائیت یہ طعنہ دے چھوڑتی ہے کہ ارباب حکومت چاہتے ہی نہیں کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں اور ''اسلامی قوانین'' سے ان کی مراد ہوتی ہے شراب' جوئے' ریس اور زنا کی ممانعت یا عورتوں کی بے حجابی یا مردوں کے کلب اور جم خانے وغیرہ پر بندش۔ یعنی وہ اخلاقی برائیاں جن کے بارے میں ان کے تمام فرقے متفق ہیں۔ لیکن جن امور میں ان حضرات میں باہمی اختلاف ہے ان کا ذکر کبھی نہیں آئے گا۔ ان سے پوچھئے کہ یہ اخلاقی برائیاں قرآن کریم کی رو سے جرائم ہیں لیکن فرقہ بندی' اس کی نص صریح کے مطابق شرک ہے' آپ جرائم کی روک تھام کے لئے قانون سازی پر تو اس قدر زور دیتے ہیں لیکن اس شرک کو ختم کرنے کے لئے آپ کی طرف سے کبھی اشارہ تک نہیں ہوتا بلکہ اگر حکومت کی طرف سے اس کے لئے کوئی کوشش ہوتی ہے تو آپ حضرات اس کے خلاف متحدہ محاذ بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کوشش کو ناکام بنائے بغیر چین نہیں لیتے۔ مثلاً ۱۹۶۲ء کے آئین میں پرسنل لاز سے متعلق مختلف فرقوں کے الگ الگ قوانین کے تصور کو ختم کر دیا گیا تھا لیکن ان حضرات کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی اور انہوں نے آئین کی اس شق کو بدلوا کر' اس کی جگہ فرقہ وارانہ تعبیر کی شق داخل کرالی۔

گذشتہ ستمبر کے قیامت خیز ہنگامے میں ہمارے قوم کے دل میں جو بے پناہ جذبہ پیدا ہوا ہے اور اس نے جو محیر العقول کارنامے کر دکھائے ہیں۔ وہ نتیجہ ہیں اسلام کے ساتھ اس گہرے لگاؤ کا جو ہمارے عوام کے تحت الشعور میں خوابیدہ چلا آ رہا ہے اور جو اس قسم کے تصادمات کے وقت یک دم بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ متاع بیش بہا ہے اور اسے عمدہ تعمیری مقاصد کے لئے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن ہمارے پیش نظر جو سوال ہے اس کا تعلق جذبات سے نہیں' علم و بصیرت اور تفقہ و تدبر سے ہے۔ سوال زیر غور یہ ہے کہ پاکستان میں وہ نظام زندگی کس طرح متشکل کیا جائے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا؟ اور ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب غور و فکر کا متقاضی ہے۔ ہمارے عوام کے یہ جذبات بھی اس سے پہلے ضائع جاتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قوم کے سامنے کوئی متعین مقصد نہیں۔ بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ عوام بچارے نہایت خلوص نیت سے یہ قربانیاں ''اسلام'' کی خاطر دیتے ہیں اور ہمارے ہاں ابھی تک یہی متعین نہیں کہ اسلام ہے کیا۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے' ہمارے ہاں ہر ذہن میں اسلام کا الگ مفہوم ہے۔ عوام کی اسلام کے ساتھ یہ محبت ایک نادیدہ محبوب کے ساتھ عشق کے مترادف ہے۔ یعنی اقبالؒ کے الفاظ میں ہماری قوم کی کیفیت یہ ہے۔۔۔ دلے دارند و محبوبے ندارند۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک یہ جذبہ لاشعوری طور پر کام کرتا ہے قوم بے پناہ قربانیاں دیتی چلی جاتی ہے اور جب وہ اس پر شعوری طور پر نگہ بازگشت ڈالتی ہے اور اپنے گرد و پیش دیکھتی ہے تو اسے کچھ اور ہی نظر آتا ہے اور یوں ان کا وہ جذبہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے بلکہ بعض اوقات اس کا ردعمل بڑا شدید ہوتا ہے۔ عوام کے اس قیمتی جذبے کو مستقل شعار بنانے کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ اسلام کا صحیح مفہوم متعین

کر کے اسے عملی نظام کی شکل میں متشکل کیا جائے جس کے حسین و خوشگوار نتائج اسے ان کی نگاہوں میں دنیا کی ہر متاع سے زیادہ عزیز بنا دیں اور یوں وہ اس کے تحفظ و بقا کی خاطر ہر قربانی کے لئے نہ صرف جذباتی طور پر بلکہ علیٰ وجہ البصیرت ہر وقت تیار ہوں۔

باقی رہے وہ حضرات جو یہ حکم لگاتے ہیں کہ تحریک پاکستان میں اسلام کا نام محض عوام کو ساتھ ملانے کے لئے لیا گیا تھا' ورنہ اصل مقصد تو مسلمانوں کا معاشرتی' معاشی اور ثقافتی تحفظ تھا جو ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے خطرے میں پڑ گیا تھا' تو ان کے متعلق میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کروں کہ اس سے تحریک پاکستان کے قائد (محمد علی جناح) کے متعلق جس کردار کا تصور یہ حضرات پیش کرتے ہیں وہ تصور قائداعظمؒ کے دشمنوں تک نے بھی پیش نہیں کیا تھا۔ ان کے دشمنوں نے ان کے خلاف بہت کچھ کہا لیکن اتنا کہنے کی جرأت کسی کو بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ ''منافق'' تھا۔۔۔ اور منافق بھی ایسا جو حصول مقصد کی خاطر اسلام جیسے مقدس جذبے کی آڑ لے رہا تھا' اسے (Exploit) کر رہا تھا۔ جدوجہد آزادی کے دس سالہ دور میں قائداعظمؒ کی تقاریر' تحریرات' بیانات' خطوط وغیرہ کو دیکھئے۔ وہ مسلسل اور متواتر پکارتے چلے جاتے ہیں کہ اس مطالبے کی بنیاد ہمارے دین کا تقاضا ہے۔ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں تو بر بنائے مذہب۔ ہم اپنی جداگانہ مملکت چاہتے ہیں تو اس لئے کہ

''ہم اس میں اپنے ضابطہ حیات' ثقافتی نشوونما' روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔''

وہ واضح طور پر بتاتے رہے کہ:

''پاکستان سے یہ مطلب نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی ہی حاصل نہیں کرنی' ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔''

جب پوچھا جاتا کہ تشکیل پاکستان سے ہوگا کیا تو وہ جواب میں کہتے:

''اس سے یہ آواز فضائے عالم میں گونجے گی کہ دنیا میں ایک ایسی مملکت بھی ہے جو اسلام کی عظمت گذشتہ کو ازسرنو زندہ کرے گی۔''

آپ کو غالباً یاد ہوگا کہ ایک دفعہ (1941ء) میں مسٹر گاندھی نے قائداعظمؒ سے یہ کہہ دیا تھا کہ آپ سیاست میں مذہب کو کیوں گھسیٹ لائے ہیں' تو اس کے جواب میں انہوں نے برملا کہا تھا کہ:

''میرے نزدیک زندگی کا کوئی شعبہ ہو' مذہب انسان کے ہر عمل کو اخلاقی بنیاد عطا کرتا ہے۔ اگر مذہب کو بیچ میں نہ لایا جائے تو انسان کی زندگی میں شور و شغب کے سوا رہ کیا جاتا ہے!''

قائداعظمؒ نے اسلامی مملکت کے بنیادی امتیاز کے متعلق جو کچھ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کے سوال کے جواب میں بتایا تھا اس کا ذکر میں ابھی ابھی کر چکا ہوں۔

ہمارے یہ پاکستانی کرم فرما کہتے ہیں کہ جناح نے اسلام کا نام محض عوام کو ساتھ ملانے کے لئے چپکا رکھا تھا ورنہ اس کا مقصد کسی اسلامی مملکت کا قیام نہیں تھا۔ لیکن سنئے کہ اس زمانے کے ہندو کیا سمجھتے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں لدھیانہ میں اکھنڈ

ہندوستان کانفرنس منعقد ہوئی جس کے صدر مسٹر منشی تھے۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا تھا۔

''آپ کو کچھ معلوم ہے کہ پاکستان کیا ہے؟ نہیں معلوم تو سن لیں! نظریۂ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ گوشوں میں اپنے لئے ایسے مساکن بنالیں جہاں زندگی اور طرز حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھو کہ پاکستان مسلمانوں کا ایسا خطہ ہوگا جس میں اسلامی حکومت قائم ہو۔''

ہندو تو قائداعظمؒ کے اسلامی نعرے کو حقیقت پر مبنی سمجھتا تھا اور ہمارے یہ مسلمان بھائی اسے ''دروغ مصلحت آمیز'' سے تعبیر فرماتے ہیں! پھر اس کا کیا جواب کہ جب پاکستان بن گیا اور (بقول معترضین) قائداعظم کے پیش نظر وہ مصلحت یا ضرورت نہ رہی جس کے تابع وہ اپنی ہر بات کے ساتھ اسلام کا نام چپکائے رکھتے تھے تو انہوں نے اس وقت بھی اسلام کا نام نہ چھوڑا۔ انہوں نے جولائی ۱۹۴۸ء میں اسٹیٹ بنک کا افتتاح کرتے ہوئے جو تقریر کی تھی اور (جو غالباً ان کی زندگی کی آخری تقریر تھی) اس میں انہوں نے کہا تھا:

''ہمارے پیش نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوشحالی اور اطمینان کی زندگی بسر کرسکیں۔ اس مقصد کا حصول مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہئے اور دنیا کے سامنے ایسا نظام پیش کرنا چاہئے جو اسلامی مساوات اور عدل عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔ صرف یہی طریق ہے جس سے ہم اس فریضے سے عہدہ برا ہوسکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے اور ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچالے جائے اور نوع انسان کی بہبود و مسرت اور خوش حالی کا ضامن ہو سکے۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہوسکتا۔''

یہ تھی جناح کی آخری پکار جب اسے کسی 'مصلحت آمیزی' کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بے شک مسلمانوں کی معاشرتی اور معاشی بہبود چاہتا تھا لیکن صرف قرآنی نظام کی رو سے، جس میں آج بھی یہ قوت موجود ہے کہ وہ ہر اس قوم کو جو اسے اپنا مسلک زندگی قرار دے لے نہ صرف مادی سرفرازیوں سے ہمکنار کردے بلکہ شرف انسانیت کی معراج کبریٰ تک پہنچادے۔۔۔ ''یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہوسکتا۔''

حنیف: پرویز صاحب! آپ نے ''نصرت'' کے گذشتہ شماروں میں جناب منظور قادر سے میرا ایک انٹرویو دیکھا ہوگا۔ منظور قادر صاحب نے جس نقطۂ نظر سے دین اور سیاست کے رشتے پر بات کی ہے وہ بظاہر آپ کے نقطۂ نظر کے قریب قریب برعکس ہے۔ انہوں نے اسلام کے مروجہ تصورات کو دیکھ کر یہ کہا ہے کہ اسلامی تعلیمات کو سیاسی یا معاشرتی قالبوں میں ڈھالنے سے ہمارے ہاں کوئی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ لیکن کیا ان کی یہ رائے آپ سے قریب نہیں کہ یہ فضا اسلام کے بارے میں مروجہ تصورات کی بنا پر ہے۔

پرویزؔ: میں نے اس انٹرویو کی روئیداد ''نصرت'' میں دیکھی ہے۔ اسے پڑھ کر مجھے افسوس ہوا اور یہ اس لئے کہ میرے دل میں

منظور قادر صاحب کی قانونی قابلیت کی بڑی قدر ہے۔ وہ ایک بلند پایہ وکیل ہیں اور مملکت پاکستان میں وزیر خارجہ بھی رہ چکے ہیں۔ نیز مغربی پاکستان کی عدلیہ کے چیف جج بھی۔ ایک وکیل اور جج کی حیثیت سے مقدمات میں ان کے سامنے ہر قسم کا رطب و یابس پیش ہوتا ہے، جھوٹے دعوے دائر کئے جاتے ہیں، جھوٹی شہادتیں پیش کی جاتی ہیں۔ جعلی دستاویزات تیار کی جاتی ہیں اور انہیں اصل اور سچی کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ منظور قادر صاحب کا منصب یہ ہے کہ وہ غلط کو صحیح اور جعلی کو اصلی سے الگ کریں اور پھر پیش نظر مقدمے کے متعلق کسی نتیجے پر پہنچیں۔ مجھے افسوس اس بات سے ہوا کہ چھوٹے چھوٹے مقدمات تک میں تو وہ اس طریق کار کو اختیار کرتے ہیں لیکن جب ان کے سامنے ''اسلام کا مقدمہ'' پیش ہوا تو انہوں نے اس کا ذرا بھی خیال نہ کیا اور جو باتیں اسلام کی طرف منسوب کر کے ان کے سامنے پیش کی گئیں اسے انہوں نے عین اسلام قرار دے دیا اور پھر اس کے خلاف ڈگری صادر کر دی۔ انہوں نے خدا، رسول، وحی، عبادت، گناہ، ثواب، توبہ، صدقہ وغیرہ کے خلاف اپنے اعتراضات کی بنیاد ان باتوں پر رکھی جو معاف فرمائیے، ہمارے ہاں داستاں سرا واعظوں اور قصہ گو خطیبوں کے یہاں یا پکی روٹی جیسی کتابوں میں لکھی ملتی ہیں۔

حنیف: پرویز صاحب! کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہمارے معاشرے کے بیشتر افراد اسی اسلام سے واقف ہیں جو پکی روٹی اور واعظوں کے خطبوں سے مرکب ہے۔ اس لحاظ سے اگر منظور قادر صاحب نے کہا ہے کہ اسلام کی مروجہ شکلیں اس لائق نہیں کہ ان سے وہ نتائج پیدا ہو سکیں جن کی ہمیں آرزو ہے تو کیا وہ حق بجانب نہیں؟ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ منظور قادر صاحب خود بھی اکثر مروجہ عقائد سے مطمئن نظر نہیں آتے۔

پرویز: اگر منظور قادر صاحب یہ فرما دیتے کہ ان کے اعتراضات ان عقائد، تصورات اور رسومات کے خلاف ہیں جنہیں آج کل اسلام کے نام سے موسوم کر کے پیش کیا جاتا ہے تو ان کی تنقید حق بجانب ہی نہیں بلکہ میرے خیال میں کچھ نرم سی تصور کی جاتی۔ لیکن نہ صرف یہ کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ۔۔۔ بالارادہ یا بلاارادہ، وہ حقیقی اسلام کے بعض بنیادی تصورات تک کو بھی اپنی تنقید کی زد میں لے آئے ہیں اور اس تنقید کی بنیاد وہ عقائد و تصورات ہیں جو ہمارے ہاں بلا سند و تحقیق متوارث چلے آ رہے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی تئیس سالہ زندگی میں جو جو واقعات سامنے آئے قرآن نے ان کے متعلق ہدایت دی ہے۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ یہ ظاہر ہے کہ اس تئیس سال کے عرصے میں محدود واقعات ہی سامنے آ سکتے تھے، سب کے سب نہیں۔ نیز نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد واقعات کا سلسلہ ختم نہیں ہو گیا، ہر نئے دن نت نئے واقعات کا ظہور ہوتا رہتا ہے اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قرآن میں دی ہوئی راہنمائی اس زمانے کے لئے تو کافی ہو سکتی تھی، یہ نہ تو ابدی ہو سکتی ہے اور نہ ہی ایسی مکمل کہ گذشتہ، موجودہ اور آنے والے تمام واقعات و حوادث کو محیط ہو سکے۔ یہ تصور قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے اور (جیسا کہ انہوں نے بیان کیا ہے) مبنی ہے ''شان نزول'' کے نظریئے پر۔ لیکن اگر موصوف ''مروجہ اسلام'' سے قطع نظر کر کے خود قرآن کریم پر غور فرما لیتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ ''شان نزول'' کا نظریہ خود قرآنی تعلیم کے خلاف اور بعد کا وضع کردہ ہے۔ قرآن کریم اس کی بار بار تصریح کرتا ہے کہ یہ وہی دین ہے جسے خدا نے نوحؑ کو دیا۔ ابراہیمؑ کو دیا۔ موسیٰؑ کو دیا، عیسیٰؑ کو دیا، تمام سابقہ انبیاء (علیہم السلام) کو دیا۔ سو جو

دین روز اول سے چلا آ رہا تھا اس کے متعلق یہ کہنا دین کی حقیقت سے بے گانگی کی دلیل ہے کہ وہ مجموعہ ہے ان ہدایات کا جو ان واقعات کے پیش نظر دی گئیں جو رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اور اس معاشرے میں پیش آئیں اور بس اور پھر جس دین کے متعلق قرآن میں یہ کہہ دیا گیا ہو کہ وہ تمام نوع انسان کے لئے مکمل ضابطۂ حیات ہے اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد رونما ہونے والے واقعات کو محیط نہیں ہو سکتا' قرآن کے اس دعوے کے خلاف ہے۔

قرآن کریم میں دی ہوئی ہدایات کے متعلق منظور قادر صاحب کا یہ ارشاد کہ وہ (Trial and Error) کے تجرباتی طریق کا نتیجہ تھیں' وحی کے تصور کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتا ہے (Trial and Error) عقل انسانی کا طریق ہے جو مستقبل کا علم نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس وحی ہے جو عقل انسانی کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ وہ اس خدا کی طرف سے ملتی ہے جس کا علم حدود فراموش ہے۔ لہٰذا اسے عقل کا تجرباتی طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ منظور قادر صاحب کے اس دعوے کی بنیاد ''ناسخ و منسوخ'' کا عقیدہ ہے۔ لیکن یہ عقیدہ خود قرآن کی تعلیم کے خلاف اور بعد کا وضع کردہ ہے۔ اس کے لئے بطور مثال انہوں نے شراب کی ممانعت سے متعلق قرآنی احکام پیش کر کے فرمایا کہ دیکھئے! یہ احکام کس طرح بتدریج آئے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ (Trial and Error) کا نتیجہ ہیں۔ اس وقت اتنی فرصت نہیں کہ میں شان نزول یا ناسخ و منسوخ جیسے نظریات پر تفصیلی بحث کروں' نہ ہی اس کا تعلق آپ کے سوال سے ہے' البتہ ممانعت خمر سے متعلق احکام والی مثال کے سلسلے میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ تدریجی احکام (Trial and Error) کے استقرائی طریق کا نتیجہ نہیں تھے' اس سے دراصل یہ بتانا مقصود تھا کہ افراد میں جو برائیاں اس طرح زمین گیر ہو چکی ہوں کہ ان کا ایک دم استیصال طبعی طور پر ناممکن ہو ان کی اصلاح بتدریج کرنی چاہئے۔ شراب جس شخص کی گھٹی میں پڑ چکی ہو اس کے لئے اس کا یک لخت چھوڑ دینا ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔ اس کی یہ عادت بتدریج چھڑانی چاہئے۔ یہ تھی مصلحت اس قسم کے احکام کو بتدریج نافذ کرنے کی۔ چنانچہ اگر ہمیں آج بھی اپنے معاشرے میں شراب کو بند کرنا ہو تو اس کے لئے قرآن کریم کا تجویز کردہ تدریجی طریق ہی اختیار کرنا ہوگا۔

حنیف: پرویز صاحب! مہربانی سے ذرا دو ایک مثالوں سے واضح کریں کہ قرآن حکیم اپنے اصولوں کو قائم رکھتے ہوئے بدلتے ہوئے زمانے اور اس کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے سیاسی' معاشرتی اور معاشی تقاضوں سے کیونکر عہدہ برا ہوتا ہے۔

پرویز: جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے قرآن کریم کے ابدی اصول اس چار دیواری (Boundary Lines) کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے ہم ہر زمانے میں عملی پروگرام خود وضع کر سکتے ہیں۔ مثلاً اس کا غیر متبدل اصول یہ ہے کہ: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ (42:38) ''امت مسلمہ کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے یہ اصولی حکم بھی دے دیا کہ: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ (5:44) ''جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ مومن نہیں' کافر ہیں۔'' ان اصولی ہدایات کے پیش نظر ہمارا طریق کار یہ ہو گا کہ جو معاملہ ہمارے سامنے آئے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم اس باب میں کیا راہنمائی دیتا ہے۔ اس راہنمائی کو سامنے رکھتے ہوئے باہمی مشورے سے یہ طے کیا جائے کہ اس معاملہ کے متعلق ہمیں کیا فیصلہ کرنا چاہئے۔ اس باہمی مشورے کا طریق عمل

کیا ہوگا' یہ حالات کے ساتھ بدلتا جائے گا۔۔۔رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کے زمانے میں جب وسائل رسل ورسائل محدود تھے اور طریق تھا۔ آج اس کا طریق اور ہوگا۔ مشاورتی نظام کا اصول غیر متبدل رہے گا۔ البتہ اس نظام کی عملی شکل حسب ضرورت بدلتی جائے گی۔ یا مثلاً قرآن کریم کی اصولی راہنمائی یہ ہے کہ تمام افراد اور ان کی اولاد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی نظامِ معاشرہ کے ذمے ہوگی۔ نَحۡنُ نَرۡزُقُکُمۡ وَاِیَّاہُمۡ ۚ (6:151)۔ اب یہ کام نظام معاشرہ کا ہوگا کہ وہ فیصلہ کرے کہ معاشی نظام کی ہیئت کیا ہو جس کی رو سے کوئی فردِ معاشرہ اپنی بنیادی ضروریات زندگی اور سامان نشوونما سے محروم نہ رہے۔ اس نظام کی شکلیں حسب ضرورت بدلتی جائیں گی۔ لیکن یہ اصولی مقصد اپنی جگہ قائم رہے گا۔

حنیف: شراب کی حرمت پر بات کرتے ہوئے آپ نے بعض معاشرتی برائیوں کو ختم کرنے کے لئے قرآن کے تدریجی طریق کار کا ذکر کیا ہے۔ میں ایک ضمنی سوال کا موقع نہیں کھونا چاہتا۔ قرآن کریم میں معاشرتی جرائم کے لئے سزائیں بھی بیان ہوئی ہیں۔ مثلاً چوری کے سلسلے میں ہاتھ کاٹنے کی سزا کا ذکر آیا ہے۔ میرے خیال میں یہ چوری کی انتہائی سزا ہے نہ کہ ابتدائی۔ کیا حرمت شراب کی طرح سزاؤں کے سلسلے میں بھی منزل بہ منزل چلنے کا حکم نہیں۔ اور کیا منزل بہ منزل چلنا اس لئے ضروری نہیں کہ جرائم کا معاشرتی نظام کے حالات سے اٹوٹ تعلق ہے۔ یہ تو دھاندلی ہوگی کہ معاشرتی حالات تو بے شک غیر اسلامی ہوں اور سزائیں اسلامی دینی شروع کر دی جائیں۔

پرویز: آپ نے صحیح سمجھا ہے کہ قرآن کریم نے جرائم کی جو سزائیں مقرر کی ہیں وہ انتہائی ہیں۔ لیکن اس سے کم تر یا تدریجی سزائیں اس نے خود متعین نہیں کیں۔ اسے اس نے حالات کے مطابق نظام معاشرہ کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ واضح ہے کہ سزا تجویز کرتے وقت متعدد حالات وکوائف کا پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔۔مثلاً معاشرے کی عام اخلاقی سطح' معاشی حالات کے تقاضے' خود ملزم (یا مجرم) کی نفسیاتی کیفیت' اس کی تعلیم وتربیت اور ماحول وعواطف کے اثرات وغیرہ۔ ان تمام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سزا کا فیصلہ کیا جائے گا۔ آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ قرآن کریم نے لونڈیوں کے لئے زنا کی سزا آزاد عورتوں سے نصف مقرر کی ہے اور اضطراری حالت میں ان چیزوں کے کھا لینے کی بھی اجازت ہے جو عام حالات میں حرام قرار دی گئی ہیں۔ یہ وہ اصول تھا جس کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے ان غلاموں کو کوئی سزا نہیں دی تھی جنہوں نے بھوک سے مجبور ہو کر خوراک کی چوری کی تھی بلکہ سزا ان کے مالکوں کو دی تھی کہ ان کے جرم کے ذمہ دار تم ہو۔ اگر تم انہیں پیٹ بھر کر کھانے کو دیتے تو یہ کیوں چوری کرنے پر مجبور ہوتے! لہٰذا غیر اسلامی معاشرے میں اسلامی سزائیں اَن مِل بے جوڑ سی بات ہے۔ اسلام کے اصول واحکام' مؤکدات وتنبیہات' اوامر ونواہی' فرائض وواجبات' حقوق اور ذمہ داریاں اسلامی نظام معاشرہ کے مختلف پرزے ہیں۔ یہ اسلامی نظام کے اندر اپنی اپنی جگہ ٹھیک ٹھیک نتائج مرتب کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ نظام نہ ہو تو ان کی کیفیت ایک مشینری کے بکھرے ہوئے پرزوں کی سی رہ جاتی ہے۔ اسی لئے تو قرآن نے کہا ہے کہ: ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً ۪ (2:208) ''تم اس نظام خداوندی میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔'' اور اس کے برعکس سختی سے کہا ہے کہ ''کیا تم ایسی روش اختیار کرنا چاہتے ہو کہ کتاب کے ایک حصے پر ایمان رکھو اور دوسرے حصے سے انکار کرو۔

اگر ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں اس دنیا میں ذلت وخواری نصیب ہوگی اور آخرت میں عذاب شدید۔''

لیکن یہ ٹھیک ہے کہ جب ہم اپنی موجودہ سطح سے ابتدا کریں گے تو اس معاشرے کے انتہائی نقطے تک بتدریج پہنچیں گے۔ اس نسبت سے ہمیں جرائم اور ان کی سزاؤں کا جائزہ بھی لینا ہوگا۔ سزا تو ایک طرف' حضرت عمرؓ نے ایک ذمی کا یہ کہہ کر ٹیکس واپس کر دیا تھا کہ تم ابھی حال ہی میں اس حکومت کے زیر حفاظت آئے ہو' اس نے تمہارے لئے کیا کیا ہے جو تم اس کا ٹیکس ادا کرنے کے لئے آ گئے ہو!

باقی رہا دین اور سیاست کا اٹوٹ رشتہ' سو اس کے متعلق بھی ہمارے یہ معترضین ایک غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اس تعلق کی وضاحت ایک مثال سے سمجھئے۔ قرآن کریم میں ایک اصولی حکم دیا گیا ہے کہ: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ (5:8) ''کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔'' یہ ہمارا دین ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی حالت میں اور کسی قوم کے سلسلے میں بھی اس سے انحراف نہیں کر سکتے۔ ہم میں سے اگر کوئی کسی وقت اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ خدا کی بارگاہ میں مجرم قرار پاتا ہے۔ اور اگر (معاذ اللہ) یہ کہہ دیتا ہے کہ میں اس اصول کو نہیں مانتا تو وہ مسلمان ہی نہیں رہتا۔ یہ ہے وہ دین جسے سیاست سے الگ کر دیا جائے ''تو رہ جاتی ہے چنگیزی''۔ اس کے برعکس وہ سیاست ہے جس میں ہر معاملے کا فیصلہ ''مصلحت'' پر مبنی ہوتا ہے۔ اس سیاست کے نہ کوئی غیر متبدل اصول ہوتے ہیں نہ اٹل ضوابط۔ ''مصلحت'' کے مطابق اصول وضوابط مرتب ہوتے ہیں اور مصلحت ہی کے مطابق ان میں ردوبدل کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ سیاست ہے جس سے دنیا اس قدر مادی ترقی کے باوجود جہنم بن رہی ہے۔

حنیف: جب ہم عمل کے میدان میں دین اور سیاست کے رشتے کی کڑیاں تلاش کرتے ہیں تو اسلام اور جمہوریت کے باہمی تعلق کو زیر بحث لانا لازم ہو جاتا ہے۔ جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہر اچھائی کا حامل اسلام جمہوریت کی خوبیوں سے بھی متصف ہے۔۔۔ اسلام کے دامن میں جمہوریت کی خوبی باہمی مشورے کے حکم کی صورت میں موجود ہے۔ لیکن جہاں تک جمہوریت کے مروجہ نظام کا تعلق ہے سیاسی جماعتوں کے بغیر اس کا تصور بھی لوگوں کے لئے محال ہے اور ادھر اسلام ہے کہ وہ کسی قسم کے تفرقے یا پارٹی بازی کا متحمل نہیں۔ اس صورت میں آپ کے نزدیک ہمارے دین اور ہماری سیاست کے درمیان کون سا مقام اتصال ہے جہاں جمہوریت سے وابستگی کا شوق بھی پورا ہو سکے اور وہ راہ بھی ہم سے نہ چھوٹے جو خدا نے سورہ المائدہ میں اسلام کے نام سے ہمارے لئے چنی تھی۔

پرویز: حنیف صاحب! جس طرح اسلام ایک اصطلاح ہے اسی طرح موجودہ سیاست میں جمہوریت بھی ایک اصطلاح ہے۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ان مباحث کے متعلق صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم یہ متعین طور پر معلوم کر لیں کہ قرآن کریم کی رو سے ''اسلام'' کا مفہوم کیا ہے۔ جب یہ متعین ہو جائے تو اس کے بعد یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ ''جمہوریت'' کی اصطلاح کا مفہوم کیا ہے۔ اس کے بعد ہی ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ پیش نظر سوال پر غور کیا جا سکے۔

(جاری ہے)

ڈاکٹر علی نصیر عباسی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تشکیل معاشرہ اور قرآنی کردار

جدید سائنس کے انکشافات

یوم پاکستان کے موقع پر بزم طلوع اسلام کراچی (صدر) کے زیر اہتمام 31 مارچ 2002ء کو قرآنک سنٹر (صدر) میں ایک سیمینار منعقد کیا گیا تھا۔ اس سیمینار میں معروف ماہر نفسیات ڈاکٹر علی نصیر عباسی نے ''تشکیل معاشرہ اور قرآنی کردار'' کے موضوع پر لیکچر دیا تھا جس میں قرآنی اقدار اور عصری اکتشافات کے حوالے سے اعلیٰ کردار کی تشکیل کے ضمن میں نہایت پُرمغز اور معلومات افزا گفتگو کی گئی تھی۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس مفید اور کردار کی تعمیر میں معاون گفتگو سے قارئین طلوع اسلام کو محروم رکھا جائے۔ (سلیم اختر)

یہ سنہ 2002ء اور مارچ کی 31 تاریخ ہے' 23 مارچ کی یاد میں لگتا ہے کہ ہم سب یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ آپ سب کو مبارک باد ہو اور آپ سب پر سلام و رحمت ہو کہ ایک اچھے مقصد کے لئے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں ورنہ بقول علامہ اسلم جیراجپوری مسلمانوں کا اجماع و اتحاد (موجودہ تاریخ) میں ہمیشہ یا اکثر باطل پر ہی ہوا ہے۔ اس تقریب سعید پر میں تمام احباب' جو یہاں موجود ہیں اور انتظامیہ بزم طلوع اسلام کراچی صدر کی خدمت میں بھی دلی ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔ جناب محترم اقبال صاحب اور ان کی ٹیم قابل تعریف ہیں کہ یہ کام محنت طلب ہیں اور ان میں کافی ٹائم اور دوسرے Resources بھی لگتے ہیں۔ اس قسم کے اجتماعات میں مجھے سائنسی تحقیق آپ کے سامنے پیش کرنے کا موقع ملتا ہے تاکہ آپ کی زندگیاں سنور جائیں اور یہ ثابت ہو کہ ''قرآن حق ہے اور باقی سب افسانے یا وہم و گمان و قیاس''۔ ارشاد قرآنی ہے کہ ''ہم انہیں انفس و آفاق میں نشانیاں دکھاتے جائیں گے تاآنکہ یہ بات ابھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن فی الواقع حقیقت ثابتہ ہے۔'' (41:53)۔ میرا طریقۂ کار یہی رہا ہے اور اس آیت میں میرا شعبہ یا موضوع ''عالم انفس'' یعنی نفس انسانی کے معاملات ہیں یعنی Psychology اور Psychiatry وغیرہ۔ ڈاکٹر ودود ''عالم آفاق'' سے بحث کرتے تھے۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت دے۔ ایسے انسان اور عالم شاید ہی مسلمانوں میں پیدا ہوں۔ آج کی اس بامقصد محفل میں ایسے ہی معاملات سیکھیں گے۔ تاکہ ہمارے دل و دماغ بدل جائیں اور ہماری زندگی اعلیٰ بن سکے۔ اگر ہماری محفلیں بے مقصد ہیں' یعنی ہم ان میں کچھ اعلیٰ وارفع نہیں سیکھتے ہیں تاکہ

عملی زندگی بہتر ہو تو ایسی محفلوں کا منعقد کرنا وقت کا اور زندگی کا زیاں اور محض فرار زندگی یعنی Escapism کی قسم ہے۔ اس لئے آپ سے تھوڑی سی محنت چاہوں گا۔ یعنی آپ کو تھوڑی Effort کوشش کر کے گہری توجہ قائم رکھنی ہو گی۔ قرآن حکیم اور علم نفسیات کا قانون مسلمہ ہے کہ ''بغیر محنت وجدوجہد کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا''۔ ہمارا موضوع کچھ ایسا ہی ہے۔ اس کے علاوہ ایک ضروری ہدایت جو نفسیاتی نوعیت کی ہے کہ میرے لیکچر کا تعلق بڑے نازک گوشوں سے ہے' اس میں عین ممکن ہے کہ آپ کے دل و دماغ میں منفی جذبات واحساسات شعوری ولاشعوری طور پر پیدا ہوں۔ تو اس کا ذمہ دار میں نہیں ہوں۔ وہ آپ کا ذاتی ردعمل (Psychosocial-Response) ہے۔ میرا مقصد آپ کے جذبات کی توہین نہیں ہے۔ اگر آپ کو یہ محسوس ہو تو یہ آپ کا ذاتی جذباتی ردعمل ہے۔ آپ کی دل آزاری میرا مقصد نہیں' ہو سکتا ہے میری اپیل آپ کی ''عقل'' یا ''Reasoning Faculty'' سے ہے جذبات سے نہیں۔ آپ میں اگر منفی ردعمل پیدا ہو' تو ''علم'' حاصل کرنے اور سیکھنے کے ردعمل کو بیدار کرنے کی کوشش کریں۔ نا کہ جذباتی ردعمل وغیرہ۔ ورنہ آپ کچھ بھی سیکھ نہیں سکیں گے۔

ہمارا موضوع ہے تشکیل معاشرہ (پاکستان اس میں شامل ہے) کے لئے قرآنی کردار کی تشکیل۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ 'پاکستانی معاشرہ' کے لئے یا کسی اور معاشرہ کے لئے بھی ''قرآنی کردار'' کی ضرورت؟ لیکن کیوں؟ اس سے کیا فائدہ؟ اور ایسا نہ کرنے سے کیا نقصان ہوگا؟ اس طرح کے زندگی کے اہم ترین مسائل پر تو تحقیق سب سے زیادہ مسلمان ممالک میں ہونی چاہئے تھی۔ بہرحال کس کس بات پر روئیں اور ہمارا تحقیق سے کیا واسطہ؟ مفکر عظیم جناب پرویز صاحب نے ایک بار بڑے دکھ سے اور الم انگیز انداز میں ٹھیک کہا تھا کہ ''پاکستان میں ''علم'' جنس کا سد سمجھا جاتا ہے''۔

میں شروع ہی سے اپنا نکتۂ نظر بتا دینا چاہتا ہوں کہ چاہے وہ پاکستان کی تشکیل ہو یا کسی بھی معاشرہ کی تعمیر وبقا' اس کا دارومدار ''کردار'' یا ''کیریکٹر'' پر ہی ہے اور ہمیشہ یہی قانون رہا ہے اور رہے گا۔ ماضیٔ قریب میں (1947) آزادیٔ وتشکیل ملک پاکستان کی وجہ بھی ''کردار'' تھا اور مزید ترقی وبقا بھی ''قرآنی کردار'' کے ذریعے ہی سے ہوگی ورنہ نہیں۔

میں یہی حقیقت جدید سائنس کی تحقیقات سے ثابت کرنا چاہوں گا۔ قرآن حکیم کا سارا زور ہی کردار پر ہے یعنی "Character Is Destiny"۔ قومی معاملہ ہو یا معاشرتی یا شخصی (Individual/Personal) ہو' یہ ہی قانون ہے۔ یعنی تشکیل کردار یا کیریکٹر سازی کے بغیر انسانی مسائل حل نہیں ہوں گے چاہے آپ کچھ بھی کر لیں۔ کراچی کے Defence میں رہ لیں یا امریکہ چلے جائیں یا چاند پر چلے جائیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ آیئے مزید تفصیل سے سمجھیں یعنی سائنس کی بارگاہ میں چلتے ہیں۔

اس علم کو یا Study کو عام طور پر نفسیات میں "Characterology" کہا جاتا ہے۔ یہ اب تو ایک باقاعدہ شعبۂ علم بن چکا ہے۔ اب اس کے بڑے بڑے

ماہرین تحقیق و تجربات سے اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ زندگی کے ہر شعبہ میں، خاص طور پر معاشرتی اور تنظیمی معاملات میں تشکیل کردار یعنی لیڈروں کا کردار ''اعلیٰ'' ہونا ضروری ہے۔ ورنہ سب کچھ بے کار ہے۔ ساری کوششیں جو صدیوں سے ہو رہی ہیں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔

ابھی ایک ریسرچر Sheehy نے تشکیل معاشرہ اور کردار سے متعلق 25 سالہ تحقیق کا نام ہی "Character" رکھا ہے۔ جس کی ابتداء ہی کچھ یوں ہے۔ ''اگر آپ عمل کا بیج بوئیں گے تو عادت کا پھل کاٹیں گے۔ پھر اگر عادت کا بیج بوئیں گے تو کردار یعنی کیریکٹر کا پھل کاٹیں گے اور پھر اگر کردار کا بیج بوئیں گے تو ہمیں ہماری منزل مقصود مل جائے گی'' اصل الفاظ یوں ہیں۔

"Sow an act, and you reap a habit, Sow a habit and you reap a character, Sow a character and you reap a destiny."

اس قانون کو سامنے رکھتے ہوئے وہ اپنے نتائج پیش کرتی ہیں جو غور طلب ہیں مفہوم ہے کہ ''اور جیسے ہی، جس وقت ہمارے منتخب قومی نمائندے یا نیشنل لیڈر اقتدار ہاتھ میں لے لیتے ہیں تو اسی لمحے ان کے کردار کا بیج قوم کی تقدیر بن جاتا ہے، قوم کی منزل مقصود اسی کردار کے مطابق طے پاتی ہے۔ قوم کی تقدیر لیڈروں کے کردار پر منحصر ہوتی ہے وغیرہ۔''

"By the time they become national leaders, the candidate's character are sown... the destiny they reap will be our own".

اور آپ حضرات متوجہ ہوں کہ معاملہ غور طلب آ رہا ہے کہ:

"Finally, examining how character is formed in our national leaders, is an effective way to learn about our selves."

یہ تو ایسا لگ رہا ہے کہ قرآنی آیت کا ترجمہ ہو کہ، جیسے ہم خود ہوتے ہیں ویسے ہی ہمارے لیڈر ''یا'' جیسے لیڈر ویسی ہی قوم''..... یہ ہے پیمانہ۔

ان مسائل پر گہری اور Objective Research معروضی تحقیق کرنے والے اب بھی مغرب میں بہت کم ہیں۔ تحقیق تو وہ ہی کرتے ہیں اور ان کا یہ احسان عظیم انسانیت پر ہے۔ بہرحال ان حالات میں بڑے انتظار اور مسلسل تحقیق کے بعد ہی ایسی اعلیٰ درجے کی علمی و عملی تحقیق سامنے آتی ہیں۔ جن عظیم علماء یا مفکرین نے ان معاملات کی گہری اور وسیع ریسرچ کی، ان میں ممفورڈ کا نام بہت اونچا ہے۔ بڑا عظیم عالم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اگر ہم پورے کردار یا ساری شخصیت کو نہیں سنواریں گے تو ہم فیل ہوتے جائیں گے۔ جیسے کہ پچھلے پانچ سو سال کی تاریخ میں ہوا۔ معاشرتی و معاشی و سیاسی لحاظ سے بیرونی طور پر ہم کچھ بھی کر لیں اگر ہم نے متوازن کردار یا Balanced Personality تعمیر نہیں کی تو ہماری تہذیب تنزل کی طرف گرتی چلی جائے گی جیسا کہ ہمیشہ ہوا ہے، تو ضرورت مکمل نشوونما ذات یا کردار انسانی کی ہے۔ یہ بڑا مشکل کام ہے۔''

ڈاکٹر فرام (Fromm) جنہیں شاید نوبل انعام ملنا چاہئے تھا، لیکن مغرب کی غیر منصفانہ اور سرمایہ دارانہ ذہنیت نے گوارا نہ کیا۔ جو ایک عظیم نفسیاتی ماہر و معاشرتی علوم کے بلند ترین عالم ہیں۔ ان کی ساری زندگی اسی پیچیدہ ترین موضوع کی تحقیق میں گزری اور ان کی ہر کتاب تقریباً اسی معاملے کی تفسیر ہے۔ خاص طور پر ان کی کتابیں۔
"To Have or To Be", "The Anatomy of Human Destructiveness", The Sane Society".

بڑی ہی قابل قدر خدمات ہیں نوع انسانی کی۔ وہ ان نتائج پر پہنچا ہے کہ تشکیل معاشرہ کے لئے اعلیٰ کردار ضروری اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر تشکیل معاشرہ ممکن ہی نہیں اور ایسا کرنا تو کیا۔ ایسا سوچنا بھی غلط ہے اس کے برعکس سوچ Abnormal Mind یا Destructive Character کی علامت قرار دی جاتی ہے وغیرہ۔ اس کا کہنا ہے کہ اعلیٰ کردار "Being Mode" یا "Loving Character" (Productive-Creative Character) کے بغیر تشکیل معاشرہ ممکن نہیں۔ مثلاً "The Anatomy of Human Destructiveness" میں جو ایک Pioneering Research.... ہے اور آج تک یعنی سنہ 2002ء تک، اس کے پائے کی تحقیق نظر نہیں آتی۔ ساری کتاب میں صاف بتایا گیا ہے کہ برے یا منفی کردار یعنی Destructive Character کے لوگوں یعنی لیڈروں کے آنے سے قوموں کا کیا حال ہوتا ہے؟ اور دنیا کس دردناک عذاب سے دوچار ہوتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کی طرح کے حادثات اور ان سے پیدا ہونے والی تباہیاں اسی کا نتیجہ ہیں مثلاً Hitler (ہٹلر) اور Stalin (سٹالن) وغیرہ کے کردار کا نتیجہ انسانیت اب تک بھگت رہی ہے۔

لینن (Lenin) کی ساری زندگی کی جدوجہد کا خاتمہ کہاں ہوتا ہے دیکھئے!

لینن کی عظیم جدوجہد سے روس آزاد ہوا اور ایک معاشرتی تجربہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ لینن کردار یعنی کیریکٹر کا قائل نہیں تھا۔ لیکن زندگی کے آخری وقت میں اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو گیا۔ جب کہ (Stalin) سٹالن کو اقتدار دیا جا رہا تھا۔ تو اس نے وصیت کی کہ ایسا نہ کریں۔ لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ روسی قوم نے Stalin کے کیریکٹر یا کردار کا بیج بویا اور وہ دیکھو! آپ کے سامنے روسی قوم کا نظام تباہ ہو گیا۔ صدیوں کی محنت اور عظیم قربانیاں بے کار ہو گئیں۔ آج اس تجربہ کے نتیجے، عبرت کے لئے باقی ہیں۔ ساری انسانیت کے لئے یہ رک کر سوچنے اور سمجھنے کا مقام ہے کہ اس طرح کے جذباتی فیصلوں کا انجام ایسا ہی ہوگا۔

فرام کی آخری عظیم تحقیق "To Have or To Be" تو نام سے ہی ظاہر ہے۔ اس میں بھی وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اعلیٰ انسانی معاشرہ "Good Society" صرف اور صرف اعلیٰ انسانی کردار کا ہی نتیجہ ہے۔ اور برا یا ''انسانیت کش معاشرہ'' انسانیت کش کردار سے پیدا ہوتا ہے۔ جسے وہ "Having Mode" کہتا ہے۔ "Having Mode" کا تجربہ تو ہمیں ہر پل ہو رہا ہے۔

اس کے تجربے کے لئے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ساری دنیا اسی کردار کے نتائج بھگت رہی ہے۔

1997ء میں ڈاکٹر Bennis نے اپنی ساری زندگی کی تحقیق پیش کی ہے۔ اس کا بین الاقوامی مقام ہے اور لیڈرشپ اور "Organizations" کے بہت بڑے ماہر مانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر بینس کے نتائج بھی غور طلب ہیں نوع انسانی کے لئے۔ سنئے دل کے کانوں سے۔

''ہماری کامیابی و ناکامی کا دارومدار ہر طرح کی تنظیم میں (چھوٹی تنظیم سے قومی تنظیم تک) تنظیموں کی اوپری سطح کے کردار کی نوعیت ومعیار (Quality) پر مبنی ہے۔''

"The Success and failure of all organization, rests on the percieved quality at the top."

اور یہ کہ ''ہم لیڈروں کے بغیر چل نہیں سکتے' کوئی کام ہی نہیں کر سکتے ہیں۔ ہماری زندگی کا دارومدار لیڈروں کے کردار کی نوعیت ومعیار پر مبنی ہے''۔

"We can not function with out leaders. Our quality of life depends on the quality of our Leaders."

یعنی پھر قرآنی آیات کا مفہوم ہے کہ جیسے ہم ویسے لیڈر یا جیسے ہمارے لیڈر ہوں گے ویسی ہی قوم۔ آگے سنئے یہ سائنس دان کیا کہتا ہے:

''250 ملین امریکیوں کی زندگی کا دارومدار ہی لیڈر شپ پر ہے۔ ہمارا سارا کلچر یا سسٹم بحران زدہ ہے اور یہ بحران بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ امریکہ اپنا راستہ بھول چکا ہے۔ نشے کی لت کے معاملے میں ہم نمبر 1 (ایک) قوم ہیں۔ سارا معاشرہ' تمام تنظیمیں اور ادارے Institutions بحران میں ہیں۔ کیونکہ ہماری لیڈرشپ کا کردار یا کیریکٹر گر چکا ہے۔ یعنی ہمارے امراض کی تشخیص دراصل لیڈرشپ کا بحران ہے۔ جس سے سارے کے سارے مسائل ابھرتے ہیں۔ جب لیڈرشپ کا معیار (Quality) گرے گا مسائل حیات بڑھ جائیں گے۔ جس طرح انسان بغیر دماغ کے کام ہی نہیں کر سکتا ہے' اسی طرح سے معاشرہ لیڈروں کے بغیر چل نہیں سکتا ہے اور اس طرح سے تنزل وتباہی جاری رہے گی۔ جب تک لیڈروں کے کردار ٹھیک نہیں کریں گے ہم بحران زدہ اور تباہ ہوتے جائیں گے۔ یعنی پہلا کرنے کا کام اعلیٰ کردار کے لیڈر بنانا ہے اور پھر معاشرتی نظام بلند ہو سکے گا۔''

لیکن سوال یہ ہے کہ لیڈرشپ ہے کیا بلا؟ ڈاکٹر بنیس کا یہ جواب انتہائی غور طلب ہے۔ سنئے! وہ کہتا ہے۔

''لیڈرشپ اعلیٰ کردار کا دوسرا نام ہے۔ (Leadership is Character) یا دوسرے الفاظ میں یہ "Integrated Adult" کو کہتے ہیں۔ (نشوونما یافتہ ذات) اور مزید سمجھاتا ہے کہ 'اس کے معانی ہیں کہ 'بحیثیت انسان 'ہم' کیا ہیں؟''

(Who we are as Human Being?) اور لیڈر کی تشکیل کا عملی طریقہ (process) وہی ہے جو اعلیٰ درجہ کا انسان بننے کا طریقہ ہے۔''

ڈاکٹر فرام اپنی عظیم کتاب "The Art of Loving" میں اس امر کی وضاحت کتاب کے آخری باب میں یوں کرتے ہیں کہ ''اگر اعلیٰ کیریکٹر کی خصوصیات عملی طور

پر ہماری قوم کی زندگی میں مسلسل و متواتر منتقل نہیں ہوں گی تو کچھ بھی کر لیں، ہماری پانچ ہزار سالہ تہذیب نیست و نابود ہو جائے گی۔''

ابراہیم میسلو (Maslow) کا شمار بھی دنیا کے عظیم مفکرین اور نفسیات کے سائنسدانوں میں ہوتا ہے۔ وہ بھی عبرت انگیز و پراز نصیحت نتائج پر پہنچتا ہے کہ ''اعلیٰ سوسائٹی کے ساتھ اعلیٰ کردار شرط اولین ہے اگر اعلیٰ کردار سازی پر معاشرہ نے توجہ نہیں دی تو ہمارا وجود مٹ جائے گا۔''

آپ نے دیکھا کہ کہاں پہنچ گئے ہیں یہ علماء یا سائنسدان اور مفکر؟ دیکھئے اور غور کیجئے کہ قرآن کی آواز کہاں سے ابھر رہی ہے۔ کیا قرآن حکیم نے سچ نہیں کہا کہ ''ہم انہیں عالم انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے تاکہ یہ بات ابھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن فی الواقع حقیقتِ ثابتہ ہے''۔

پھر عرض کروں گا کہ کوئی بھی کام ہو، کوئی بھی انسانی زندگی کا معاملہ ہو اس میں کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر ایک قدم بھی ترقی ممکن نہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں یہی قانون حق ہے۔ موجودہ مسلم ممالک ہوں یا غیر مسلم قومیں، اور ہماری تباہی و بربادی و بحران کے معاملے، جس کے ہم عین گواہ ہیں ان سب معاملات کی بنیادی وجہ بھی یہی ہے۔ یعنی لیڈرشپ کا معیار اعلیٰ نہیں ہے۔ یعنی قرآنی کردار کی کمی یا نہ ہونا ہے اور یہ بات بھی غور طلب ہے کہ دنیائے علم جدیدہ کے یہ ماہرین جو تفصیل اس کردار کی بتاتے ہیں کہ جس کے بغیر بات بنتی نہیں ہے، تو آپ یہ دیکھ کر حیران ہوں گے اور بات ہے بھی باعث رشک کہ وہ قالب یا "Pattern" یا "Design" بھی قرآنی کردار کی (غیر مکمل) سی تفصیل ہوتی ہے۔ جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ مختصراً عرض ہے کہ آج متمدن دنیا اپنی تحقیق سے اس مقام اعلیٰ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے جس کا انکار وہ عملی طور پر صدیوں سے کرتی چلی آئی ہیں۔ نامور مفکر ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری جو مشرق و مغرب کا گہرا تجزیہ و مطالعہ رکھتے ہیں اور اسلامی تہذیب کے بڑے عالم ہیں۔ اپنی تحقیق کو یوں بیان کرتے ہیں کہ دل و دماغ روشن ہو جاتا ہے:

''میرا خیال ہے کہ دنیا کی متمدن قومیں آج وہاں تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ جس مقام پر فاروق اعظمؓ (حضرت عمرؓ) اس زمانے میں پہنچے تھے۔ لیکن یہ متمدن قومیں آج بھی اس مقام تک سخت جدوجہد اور مشکلات کا مقابلہ کیے بغیر نہیں پہنچ سکیں گی۔'' (الفتنۃ الکبریٰ)۔

یورپ اور امریکہ کی تاریخ میں وہ دن سیاہ ترین دن تھا، جب ان کی درسگاہوں سے یہ اعلان کیا گیا کہ قرآن یا اسلام بھی دوسرے مذاہب عالم کی طرح ایک مذہب یعنی محض "Religion" ہے اور مذہب کو تو وہ تیاگ چکے تھے۔ قرآن حکیم کو بھی وہ عین اس مقام پر لے آئے۔ دنیا کے تمام مذاہب تو مغرب کے علماء کے نزدیک افسانے بن کر رہ گئے تھے جو حقائق کا مقابلہ ہی نہیں کر سکتے تھے اور دنیا نے مغرب کے دوسرے مذاہب کے خلاف جو ردعمل اختیار کیا، اس کی شدت میں بغیر تحقیق کیے یہ جذباتی فیصلہ

عام طور پر نافذ کر دیا جس کے نتائج یہ نکلے کہ وہ قرآنی حقائق کی طرف سے اندھے اور بہرے ہو گئے۔ اس گناہ عظیم کے بعد کس طرح پھر حقائق قرآنی ان کے سامنے آ سکتے تھے۔ مزید یہ کہ ہمارے موجودہ کردار نے بھی تو انہیں روک رکھا ہے کہ ایسے ہوتے ہیں مسلمان جیسے ہم ہیں۔ جس کی وجہ سے ہم دوگنے عذاب میں مبتلا ہیں۔ یہ خدا کا قانون ہے۔

اب ہم آتے ہیں تشکیل پاکستان کی طرف' کہ اس کا کردار سے کوئی تعلق ہے بھی یا نہیں؟ ہم وقت کی کمی اور دوسرے محرکات کی وجہ سے اختصار سے کام لیں گے۔

انیسویں صدی کا آغاز ہو چکا تھا سلطنت مغلیہ آخری ہچکیاں لے رہی تھی اس برصغیر کے مسلمانوں کی داستان زوال' مایوسی اور شکست کے ان مراحل سے گزر رہی تھی جن کا انجام حسرت ناک موت کے سوا اور کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ مسلمانان ہند کے زوال و شکست کی یہ تاریک رات عہد رفتہ میں صدیوں تک پھیلی ہوئی تھی کہ 1857ء کی بغاوت ہند' شدت جذبات کی آخری کڑی ثابت ہوئی۔ یہ جرات مسلمانوں کو بڑی ہی مہنگی پڑی اور انگریزوں نے ہندوؤں کی سرپرستی کی اور یہ دونوں مظلوم و نہتے مسلمانوں کے خلاف ڈٹ گئے۔ آتش انتقام سے محکومی و محرومی و مظلومی' غربت و افلاس' بے بسی اور بے چارگی کے بھیانک سائے چاروں اطراف سے مسلمانان ہند کو گھیر چلے تھے۔ مسلمانوں کی زندگی گویا کہ ایک قبرستان سی بن گئی تھی۔ چاروں طرف حسرت و مایوسی اور شکست کی نوحہ خوانیاں بپا تھیں اور نظر آتا تھا کہ یہ قوم اب گری یا اب۔ جیسے کہ موت کا انتظار ہو۔ یہ دم توڑتی ہوئی قوم عالم سکرات میں ایک بار پھر نشاۃ ثانیہ اختیار کر سکے گی' زندہ ہو سکے گی' ممکن ہی نظر نہیں آتا تھا۔ کوئی معجزہ ہی ایسا کر سکتا تھا۔ یہ معجزہ ہوا۔ وہ معماران پاکستان کے کردار Character کا معجزہ تھا۔ ان کے عظیم کیریکٹر نے پھر سے ہمیں دنیا کی آزاد قوموں کی صف میں لا کھڑا کیا۔

تاریخ بتا رہی ہے کہ قومی زندگی کے نازک ترین موڑ پر اگر ہمیں ان عظیم و جلیل راہ نماؤں کی قیادت نصیب نہ ہوتی تو آج ہم اغیار کی غلامی اور محکومی میں مزید تباہ و برباد ہو رہے ہوتے جیسا کہ پچھلے پچاس سالوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ ہوا ہے اور موجودہ ہندو مسلم فسادات میں جو حالت زار مسلمانوں کی ہے وہ آج آپ کے سامنے ہے۔ ان حالات کی صرف ہلکی سی جھلکیاں آپ کے سامنے آتی ہیں۔ باقی حقائق ظلم و ستم کے بارے میں پروپیگنڈا (Propaganda) اور دوسرے طریقوں کی وجہ سے سامنے نہیں آ سکتے ہیں۔

ہماری نشاۃِ ثانیہ کی داستان سرسیدؒ سے شروع ہوئی اور اقبالؒ سے ہوتی ہوئی عظیم رہنما جناحؒ پر ختم ہوئی ہے۔ یہ جیت اور تشکیل معاشرہ ان تینوں کے اعلیٰ کردار کی وجہ سے ہوئی۔ مسلمان تو کیا غیر مسلم بھی ان کے کردار کے قائل ہیں۔ میں ان تینوں میں سے صرف آخری کڑی محترم جناح کے کردار کے متعلق بہت مختصر سی بحث کروں گا۔ ویسے تو ان تینوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ تھوڑا سا کہتا چلوں مثلاً علامہ اقبال جو بظاہر ہمیں لگتا ہے کہ بس محض ایک شاعر و فلسفی سے ہی تھے۔ لیکن معاملہ ایسا نہیں ہے۔

ساری زندگی انہوں نے مسلمانانِ ہند اور انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ ان کے لئے ایک تجزیہ یہ بھی ہے کہ اگر وہ اپنی صلاحیتیں کہیں اور لگاتے، وہ اتنی تھیں کہ ''فورڈ'' وغیرہ سے بھی آگے ہوتے دولت و دنیاوی معاملات میں۔

ہم بات قائداعظمؒ کی کر رہے تھے۔ سرسید و اقبال کی جدوجہد شاید بے کار چلی جاتیں اگر جناح ان کی کی ہوئی محنت کو ساحلِ مراد تک نہ پہنچاتے۔ عظیم انسان و مفکر پرویز صاحب سے بڑا گواہ اور کون ہوگا۔ انتہائی مستند گواہ۔ وہ جائزہ لیتے ہیں کہ ''جناح نے پورے دور میں ایک لمحہ کے لئے بھی جذباتی رجحان کی دلفریبیوں کا سہارا نہیں لیا۔ ہندو قوم تعلیم و ترقی اور فکر و شعور کی سنجیدگی میں مسلمانوں سے کس قدر آگے تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں بھی گاندھی جیسی شہرۂ آفاق شخصیت کو اپنی لیڈرشپ کا سکہ جمانے کے لئے مہاتمائی روپ دھارنا پڑا اور وہی انداز اختیار کرنے پڑے جو ہندو کے جذبات کو اپیل کر سکیں۔ لیکن کیا حیرت انگیز ہے سیاسیاتِ ہند کی تصویر کا دوسرا رخ کہ جناح مسلمانوں جیسی جذباتی قوم کی قیادت کے لئے میدان میں آئے اور انہوں نے قومی جذبات پر اثر انداز ہونے کے لئے اس قسم کا کوئی ادنیٰ کھیل کھیلنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

زندگی کے آخری سانس تک انہوں نے اس قسم کی دلفریب نمائشوں سے کلیتہً اجتناب کیا۔ یہی جناح کی عظمت کا وہ امتیازی نشان ہے جسے ہم ان کے کمالات میں سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور یہی تھا ہماری فتح عظیم کا وہ حقیقی راز جو حصول پاکستان کا حقیقی امین قرار پائے گا۔'' اور ''پھر اقبال کے خطاب الہٰ آباد کے ٹھیک دس سال بعد جناح 1940ء میں قراردادِ پاکستان کو لے کر میدان میں آ چکے تھے اور یہ جدوجہد 1947ء میں حصول پاکستان پر منتج ہوئی۔'' یہ سات یا دس سالوں کا عرصہ! اور پھر یہ نتائج! تاریخ انسانیت حیران ہے کہ یہ کیسے ہوا؟ مزید یہ کہ ہماری بے سروسامانی بھی تو دیکھئے۔ جائزہ ہے کہ:

''تحریک پاکستان کی مخالفتوں کا ہجوم جن کا مقابلہ قائداعظم تن تنہا کر رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس تحریک کے ہم نوا لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں تھے۔ لیکن ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ فوج کے سپاہیوں کی سی تھی۔ ان کا کمانڈر صرف ایک تھا۔ انہوں نے یہ خطرناک جنگ کس ساز و سامان کے ساتھ لڑی اس کا اعلان انہوں نے ایک اجلاس میں ان الفاظ میں کیا تھا۔ ''اورنگ زیب روڈ نئی دہلی پر میری نجی قیام گاہ کو شاید رشک کی نگاہوں سے دیکھا جائے۔ مگر یہ تو دیکھئے کہ ہمارا سیکریٹریٹ کہاں ہے، فوج کہاں ہے، میرا اسلحہ خانہ کس قدر ہے۔۔ ایک اٹیچی کیس۔ ایک ٹائپ رائٹر اور پرسنل اسسٹنٹ۔ بس یہ ہے ہمارا ساز و سامان اور اسلحہ اور فوج۔'' مفکر قرآن پرویز صاحب خراجِ تحسین یوں پیش کرتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ ''اس مردِ مجاہد کے کردار کی پاکیزگی اور بلندی ہی تھی جس سے انگریز، ہندو اور خود اسلام کے علمبردار لیڈروں کی پیہم اور متحدہ مخالفتوں کے علی الرغم اس جنگ میں ایسی شاندار کامیابی ہوئی۔'' (طلوع اسلام دسمبر 1984ء)۔

یہ تو تھی محترم پرویز صاحب کی گواہی۔ اب آخر میں لیجئے دشمن کی گواہی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی گواہی سے مستند

گواہی اور کس کی ہوگی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل انٹرویو دیا کہ ''مسلمانانِ ہند کو صرف یہ شخص ہی بامِ ترقی اور بامِ عروج پر لے گیا ہے۔

مسٹر ڈینس! میں اب عمر کے آخری دور میں داخل ہو گیا ہوں۔ بہت بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اس عمر میں غلط بات نہیں کروں گا۔ میں نے سچ بات من وعن بیان کر دی ہے۔ تقسیم ہند کے ڈرامے کا واحد کردار فقط میں ہی باقی رہ گیا ہوں۔ تمام سیاسی زندگی میں جس شخص سے سب سے زیادہ متاثر ہوا' وہ مسٹر محمد علی جناح کی ذات وشخصیت تھی۔ میں نے ان میں منافقت کا شائبہ تک نہ دیکھا۔ اتنا بلند کردار انسان اور قومی لیڈر شاید ہی مسلمانوں کو دوبارہ ملے۔''

(جنگ 24 دسمبر 2001ء)

اور تازہ ترین جائزوں میں محترمہ شمیم انور نے' ابھی دسمبر 2001ء میں' اس پہلو کا جائزہ بڑی خوبصورتی سے اور اختصار سے یوں لیا ہے جسے کوزہ میں دریا بند کرنا کہا جائے تو صحیح ہوگا۔ وہ کہتی ہیں ''تاریخ ثابت کرتی ہے کہ بہرحال جناح کے مخالفین میں برطانوی تسلط' جن کی حکومت کا سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ یعنی اتنی بڑی سلطنت اور قوت کی حامل حکومت' ہندو قوم جس میں ان کے دولتمند برلا وٹاٹا بھی شامل تھے اور مسلمانانِ ہند کی ساری مذہبی پیشوائیت اور تنظیمیں بھی۔ ان سب کا مقابلہ جناح نے کیا۔ ان کے پاس محض اور محض اعلیٰ کردار تھا اور دیکھو کیریکٹر کی جیت ہوئی۔ یہ تمام طاقتیں ہار گئیں۔ کیریکٹر بڑی چیز ہے۔'' تو محترم ساتھیو! یہ ثابت ہوا کہ قرآنی کردار کے بغیر اعلیٰ معاشرہ کی تشکیل یا تشکیلِ پاکستان یا بقاءِ وطن ممکن نہیں۔ اللہ پاکستان کو برقرار رکھے۔ لیکن اس کے لئے انسان سازی یا کردار سازی پر توجہ دینی ہوگی۔ اسی طرح سے جیسے قرآن حکیم نے کہا ہے۔

میں نے آپ کے سامنے قرآنی حقائق (Universal Laws) کو ماڈرن سائنسی تحقیق سے سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ شاید یہ قوانین آپ کے ''دماغ'' سے ''دل'' میں اتر پائیں۔ مزید یہ کہ محترم مفکرِ قرآن پرویز صاحب کے الفاظ میں ''کرنے کا کام'' یہ ہے کہ

''اس اعتبار سے آنے والے تمام زمانوں کے لئے سیرت رسول اللہ ﷺ اور سیرت خلفاء راشدین ؓ اسوۂ حسنہ قرار پائی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سیرت وکردار کے حامل مومن قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے۔ بنابریں جو قوم اسلامی نظام قائم کرنے کا عزم لے کر اٹھے اس کے لئے کرنے کا پہلا کام یہ ہوگا کہ قرآنی تعلیم وتربیت سے مومن پیدا کرے' جو نظام کو قائم کر کے چلا سکیں۔ جب یہ مومن پیدا ہو جائیں گے' تو وہ قرآنی حدود وقیود کے اندر رہتے ہوئے دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق اس نظام کا طریق کار بھی متعین کر لیں گے اور اسلامی قوانین بھی مرتب کر لیں گے۔ اس کے سوا اسلامی نظام کے قیام کی کوئی صورت نہیں۔''

موجودہ حالات میں ہم سب نے' اس سلسلے کے ارتقاء کے لئے زمین ہموار کرنی ہے اور بیج بونے ہیں۔ شاید صدیوں تک! پتہ نہیں فصل کون سی خوش نصیب قوم کاٹے گی۔ لیکن یاد رہے کہ جو بھی جدوجہد آپ سب نے قرآن کے مطابق کی تو ''نظامِ ربوبیت'' قائم ہونے میں آپ کا بھی ہاتھ ہوگا۔ کتنی بڑی سعادت ہوگی یہ اور انسانیت کی یہ بہت بڑی خدمت ہوگی۔ ایسی ہی خدمت سے کردار بنتا ہے اس

عملِ پیہم میں ہمیں عام عملی سیاست میں حصہ نہیں لینا۔ نا ہی کوئی ''عوامی'' طریقے اپنانے ہیں۔ غلط ذرائع اور وسائل کا خیال تک دلوں میں نہ لائیے۔

آخر میں میں یہ عرض کروں گا کہ میں اس موضوع کا نام یہ رکھنا چاہتا تھا۔ ''بزموں کی تشکیل و بقا کے لئے قرآنی کردار کی ضرورت'' کیونکہ بابا جی کی وفات کے بعد سے ہی ہماری تحریک کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ ہم مسلسل شدید بحران کا شکار ہیں۔ جو جاری ہے بڑی تیزی سے۔ اس کی تفصیل تو بہت طویل ہے لیکن اگر سمٹایا جائے تو وجہ اس زوال کی' سبب اس بحران کا بے زری یا وسائل کی کمی نہیں ہے۔ سبب کچھ اور ہے' وہ ہے: ''کردار یا کیریکٹر سازی نہیں ہے'' یعنی زیادہ سے زیادہ شاید ہم اپنی بزموں میں لٹریچر اور درس پھیلا رہے ہیں۔ یہ بہت ضروری ہے اور اس کام کے لئے آپ سب باعث تحسین و آفرین ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم اپنے اندر خوشگوار قرآنی کردار تخلیق نہیں کر رہے ہیں۔ نا ہی کردار سازی پر بزموں میں زور شور ہے۔ نا کوئی پلان ہیں' اپنے خاص تقاضوں کے لحاظ سے۔ مکمل طور پر تو کردار سازی نظام قرآنی میں ہی ممکن ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ عملی طور پر ہم کچھ بھی نا کریں۔ یعنی ہمارا کردار تو روائتی پاکستانی' امریکی' برطانوی یا ہندوستانی وغیرہ رہے اور نتائج کچھ اور ملیں!

اب تو بہت سے لوگ اس عظیم ترین قرآنی لٹریچر سے بھی کچھ بور ہو گئے ہیں کہ ہمارے ہاں سے (Some thing new) کے تقاضے ہوتے ہیں کہ جو کچھ موجود ہے وہ کافی نہیں۔ ہماری بزموں میں دوسرے مصنفین کی "Low quality books" یعنی غیر معیاری کتابیں بھی بیچی جاتی ہیں اور پیش کی جاتی ہیں۔ اور بظاہر وجوہات بہت سی بتائی جاتی ہیں لیکن اصل وجوہات نظروں سے اوجھل ہیں۔ یہ شعوری و لاشعوری محرکات ہمیں ہڑپ کر جائیں گے۔ قرآنی پیغام پھیلانے کے ساتھ ساتھ' اگر ہم قرآنی کردار اپنے اندر تخلیق کرتے رہے تو ہم باقی رہیں گے ورنہ نہیں۔

نوع انسانی اور متمدن قوموں کا مستقبل صرف اور صرف خالص قرآنی تعلیمات سے وابستہ ہے۔ جو کہ صرف ہمارے پاس ہے اور کہیں بھی نہیں۔ نفسیاتی و معاشرتی علوم میں یہ بار بار ثابت ہو چکا ہے کہ ''محض کتابیں شائع کرنے سے اور اعلیٰ پائے کے مقرروں کے ذریعے پیغام پھیلانے سے معاشرہ میں تبدیلی نہیں آ سکتی ہے۔ وہ فکر جو عمل پیہم سے محروم ہو تو یہ خطرہ ہوتا ہے کہ وہ فکر نیست یا فنا نہ ہو جائے۔'' ڈاکٹر فرام نے اس حقیقت کو یوں بیان کر دیا اور ڈاکٹر گروف Grof جو اس سال 2002ء میں بین الاقوامی سطح کے ماہر نفسیات و سائنسداں ہیں' وہ اس قانون کو یوں سمجھاتے ہیں کہ ''اگر فکر پر عمل نہیں کیا جائے گا تو وہ فکر معدوم ہو جائے گی۔ اس فکر کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہیں۔'' یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال اپنے مشہور لیکچرز کا آغاز ہی یوں کرتے ہیں کہ ''قرآن پاک کا رجحان زیادہ تر اس طرف ہے کہ 'فکر' کی بجائے 'عمل' پر زور دیا جائے۔'' حقیقت یہ ہے کہ بغیر عمل کے حق پر مبنی نظریہ بھی محض ایک تصور بن کر رہ جاتا ہے اور تصور کو اپنے اظہار کے لئے اشخاص کی ضرورت ہوتی ہے اگر سچے

نظریہ کو تھامنے کے لئے افراد میسر نہ ہوں تو وہ صرف کتابوں تک محدود ہو کر ماضی کی یادگار بن جاتا ہے۔

عظیم مفکر و راہنما محترم پرویز صاحب بار بار کنونشن میں تربیت کے دوران یہ کہا کرتے تھے کہ ''قرآنی نظام کی داعی جماعت کے افراد کو دیکھنا کہ انہوں نے اپنے اندر کس قدر تبدیلی پیدا کی ہے۔ ان کا قلب و دماغ کس حد تک قرآنی تصورات سے ہم آہنگ ہو چکا ہے۔ ان کی سیرت و کردار کہاں تک قرآنی قالب میں ڈھل چکے ہیں۔ ان کی آرزوؤں اور ارادوں کے محرکات کس حد تک قرآنی مقاصد ہیں۔ وہ اپنی ذات' اپنے اعزہ و اقارب اور دوسرے انسانوں کے ساتھ معاملات میں قوانین خداوندی کی کس قدر نگہداشت کرتے ہیں۔ اگر ہمارے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تو پھر آپ نے دوسرے معیاروں کے مطابق کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لی ہو' قرآن کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں۔ لیکن اگر ہمارے کردار اور تصورات میں انقلاب پیدا ہو چکا ہے تو یہ کامیابی بڑی کامیابی ہے۔''

وہ بار بار سمجھاتے تھے کہ ''قرآن کریم کا حقیقی مقصد انسان کی سیرت و کردار میں خوشگوار تبدیلی پیدا کرنا ہے کہ اتباع کتاب کا پہلا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ خود تمہاری اصلاح ہو۔ لیکن تم دوسروں کی اصلاح کے پیچھے تو لٹھ لئے پھرتے ہو' لیکن اپنی اصلاح کی فکر نہیں کرتے۔'' اور یہ کہ

''آپ نہ تو اپنی دعوت کے نتائج کی سست روی سے گھبرائیے اور نہ ہی سامریان عصر حاضر کی کامیابی کو ان کے مسلک کی صداقت کی علامت سمجھئے اور اسے اچھی طرح سے سمجھ لیجئے کہ اس میں سب سے زیادہ گراں بہا متاع سفر اور محکم ترین سامان حفاظت' آپ کی سیرت کی بلندی اور کیریکٹر کی پختگی ہے۔ آپ کی کامیابی کا سب سے بڑا راز' آپ کی اپنی ذات کے ساتھ دیانت اور دوسروں کے ساتھ حسن معاملہ میں پوشیدہ ہے۔ اگر آپ نے اپنے اندر یہ جوہر پیدا کر لیے تو پھر آپ کو دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی ہے۔'' ہم نے اس طرح کا سب کچھ پسِ پشت ڈال دیا ہے پھر اپنی تباہی کی وجہ پوچھتے ہیں۔

قرآن حکیم کی اقدار یا Values کے مطابق چلنے کی کوشش مسلسل کرنے سے اور ساتھ ساتھ اس پیغام عظیم کو عام کرنے سے ہمیں ہماری منزل مل جائے گی۔ جسے ''کردار'' یا ''کیریکٹر'' کہتے ہیں۔ اس طرح سے پیام قرآنی بہت تیزی سے پھیلے گا۔ جیسا کہ محترم پرویز صاحب کی زندگی کے ماڈل سے ثابت ہوتا ہے۔ ہمیں کچھ اسی طرح سے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق کرنا ہوگا۔ اس پرامن اور آئینی اور احسن طریقے سے جو صبر طلب اور محنت طلب بھی ہے' ہم سے قربانیاں بھی مانگتا ہے' اس سے بڑے گہرے اور دور رس اثرات نوع انسانی پر مرتب ہوتے ہیں۔ شاید سائنس میں ''کونز'' اسے Miami Effect کہتا ہے اور کوئی Covey کی اصطلاح میں Whale Effect اور ڈاکٹر فرام کے الفاظ میں Integrated-Step کہتے ہیں۔ مثلاً قائداعظم کے آٹھ یا دس سال کا قلیل عرصہ اور محترم پرویز صاحب کی بے سروسامانی اور ہر طرف سے شدت

کی مخالفت اور پھر تمام دنیا میں ان کے کام کے اثرات جو تیزی سے پھیلے اور مزید پھیلیں گے وغیرہ۔ یہ زندہ مثالیں ہیں۔ یہ سب صرف کردار سے ممکن ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ ''اپنے اللہ کے لئے ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ اور حالات و کوائف نے تمہیں جس منزل میں رکھا ہے وہیں سے حصول مقصد کی ابتدا کر دو۔(33:46)۔ تو عزیز بھائیو' بہنو اور بزرگو ہو سکے تو آج سے یہ کردار سازی کا کام شروع کر دیں۔ پھر دیکھئے خدا کا قانون آپ کو کیا بنا دیتا ہے۔ ورنہ ہم کتنی بھی بزمیں دنیا میں بنالیں۔ کسی طرح کی بھی بنالیں' یہ سب کچھ ممفورڈ کے الفاظ میں محض Decorative-Style ہوگا اور کچھ بھی نہیں اور قرآن حکیم کے معیار کے مطابق کہ ''تم نے محض چند نام رکھ دیئے ہیں جن کی حقیقت محض ناموں کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔''

اللہ تعالیٰ آپ کو قرآنی کردار کی تخلیق کی توفیق عطا فرمائے۔ قرآنی کردار کا دوسرا مطلب ہے کہ نوع انسانی کے لئے ہم روزانہ کیا دیتے ہیں۔ سرمایہ زدہ ذہنیت کا تقاضا ہے ''لینا'' اور زیادہ سے زیادہ لینا' لیکن اس سے کردار مٹتا چلا جاتا ہے' ذات برباد ہوتی جاتی ہے اور انسان پست سے پست ترین حالت کی طرف چلتا چلا جاتا ہے۔ یعنی اسفل سافلین۔ اس کے برعکس جو دیتا ہے یا زیادہ سے زیادہ فلاح نوع انسانی کے لئے دیتا ہے' وہ فلاح پاتا ہے۔ اسی کی نشوونماءِ ذات ہوتی چلی جاتی ہے۔ یعنی آپ کے سامنے ارجنٹ ترین سوال و معاملہ یہ ہے کہ ''میں دوسروں کے لئے بہتر سے بہتر کیا کر سکتا ہوں؟ What Best I can do for Others? اور یاد رکھئے کہ جب تک اس سوال کا جواب عملی طور پر آپ کی زندگی سے نہیں ابھرتا' مسلسل و متواتر' آنے والی بقایا زندگی میں' تو کردار نام کی چیز کا خیال بھی دل سے نکال دیجئے اور قرآنی پیغام تو ایسے لوگ پھیلا ہی نہیں سکتے۔ مجھے امید ہے کہ آپ سب سنجیدگی سے بار بار ان حقائق پر غور و فکر کریں گے اور زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں گے کہ یہ زندگی دوبارہ نہیں ملے گی۔ اللہ آپ سب کو خوش و خرم رکھے اور آپ کو کامیابیاں عطا کرے۔

پاکستان زندہ باد

قارئین طلوعِ اسلام توجہ فرمائیں

ماہنامہ طلوعِ اسلام کی درج ذیل سالانہ خوبصورت جلدیں 800 روپے فی جلد کے حساب سے دستیاب ہیں۔ اپنے کتب خانوں میں ''طلوعِ اسلام'' کے فائلز مکمل کرنے کے لئے آرڈر فرمائیے۔ شکریہ

1972، 1975، 1976، 1977، 1983، 1984، 1985، 1986، 1987، 1988، 1991، 1999، 2000، 2001، 2002، 2003، 2004، 2005، 2006، 2011، 2015، 2016، 2017، 2018۔

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ریاستِ مدینہ کو چلانے کے قرآنی اُصول

قرآنِ کریم کے نزدیک موجودہ انسان سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی نہیں ہے بلکہ ارتقاء کا سلسلہ جاری ہے۔ اب سے پیشتر حیوانیت کا ارتقاء ہو رہا تھا۔ اب انسانیت کا ارتقاء شروع ہوا ہے۔ انسانیت کی ابتداء اس وقت ہوتی ہے جب حیوانی پیکر میں صفاتِ خداوندی کی صلاحیت ڈال دی جاتی ہے۔ ان صفاتِ خداوندی کی نشوونما مستقل اقدار کے ذریعے ہوتی ہے اور مستقل اقدار کا اجراء صرف ریاستِ مدینہ میں ہوسکتا ہے۔ غیر اسلامی نظام جس میں قوانین خداوندی اور مستقل اقدار کی بجائے، انسانوں کے وضع کردہ قوانین جاری ونافذ ہوتے ہیں، اس میں صفاتِ خداوندی اور ذاتِ انسانی کی نشوونما نہیں ہوسکتی۔ توحید کے تسلیم کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ حاکمیت کا حق صرف ذاتِ باری تعالیٰ کو ہے۔ کسی انسان کو دوسرے انسانوں پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ارشادِ عالی ہے: فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۵۰﴾ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ (26:150-152) ترجمہ: اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور بے باک لوگوں کا حکم نہ مانو، جو ملک میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔ خدا کے قوانین کی اطاعت کرو۔ اپنے باطل نظام کے نتائج سے ڈرو۔ خدا کے قوانین کی نگہداشت کا ثبوت یہ ہے کہ ''اَطِيْعُوْنِ'' میری اطاعت کرو اور جو مسرفین ہیں ان کی اطاعت نہ کرو۔ حضرت شیخ الہندؒ نے مُسرِف کا ترجمہ بے باک کیا ہے۔ لغت میں اس کا ترجمہ بدانگا کیا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم نے اس کا درست مفہوم خود ہی بیان کر دیا ہے۔ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ (26:150)، یہ غیر اسلامی نظام چلانے والے وہ لوگ ہیں جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔ حضرت صالحؑ کو جب حکم الٰہی ہوا کہ انسانوں کے رائج کردہ غلط نظام کے خلاف جہاد کرو تو وہ پریشان ہوئے کہ یا اللہ اتنی بڑی قوم کی کس طرح اصلاح کرسکتا ہوں۔ ارشادِ عالی ہوا کہ یہ پوری قوم کی بات نہیں ہے۔ کوشش صرف یہ کرنی ہے کہ: وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾ (27:48) یہ جو اُن کا مرکزی شہر Capital City (جو اُن کا ''اسلام آباد'' ہے) ہے۔ اس میں 9 آدمی فسادی ہیں۔ وہ سارے فساد کی جڑ ہیں۔ وہ قوم کو راہِ راست پر نہیں آنے دیتے۔ ان کو درست کرلو۔ ساری قوم درست ہوجائے گی۔ سورہ الانعام میں ارشاد ہے غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنے والا ہر شخص مجرم ہوتا

ہے۔لیکن ان کے سردار اکابر مجرمین ہوتے ہیں (6:123)۔

قرآنِ کریم حقِ حکومت صرف خدا کا تسلیم کرتا ہے۔انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو کفر، ظلم اور فسق پر مبنی قرار دیتا ہے۔ قرآنِ کریم کا موضوع ہی بہترین معاشرہ کی تشکیل ہے جس کے لئے وہ خود قوانین عطا کرتا ہے اور اپنے نام پر قائم کردہ نظام کو چلانے کے لئے خود اصول بھی عطا کرتا ہے۔اُن اصولوں میں سے چند اصول ہم ترتیب وار جناب کی خدمت عالی میں پیش کرتے ہیں۔یہ بات اُصولی طور پر یاد رکھیں کہ سیکولر حکومتیں عوام کو جوابدہ ہوتی ہیں۔لیکن ریاستِ مدینہ اللہ تعالیٰ کو جوابدہ ہوتی ہے۔

(1) ریاست مدینہ چلانے کی اوّل بنیاد یہ ہے کہ اس نظام کو صرف وہ لوگ چلاتے ہیں۔ جو اس کے اہل ہیں۔اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝ (4:58) ترجمہ: بیشک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے لگو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ اللہ تم کو اچھی نصیحتیں کرتا ہے۔ بیشک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

ہر ذی شعور انسان کے پاس کچھ اختیارات ہوتے ہیں۔اگر ہر شخص اپنے اختیارات خود استعمال کرنے لگے تو معاشرہ میں نظم وضبط قائم نہیں رہ سکتا اور ایک انارکی پھیل جاتی ہے۔قتل کا بدلہ اگر ہر شخص خود لینے لگے تو معاشرہ میں امن وسکون قائم نہیں رہ سکتا۔ پُرامن زندگی گزارنے کے لئے ایک نظام ایک مملکت قائم کی جاتی ہے اور ہر شخص اپنے اختیارات اس نظام کے سپرد کر دیتا ہے کہ وہ نظام لوگوں کے اختیارات کو لوگوں کے مفاد کے لئے استعمال کرے۔قرآنِ کریم حکم دیتا ہے کہ یہ اختیارات کو لوگوں کے مفاد کے لئے استعمال کرے۔قرآنِ کریم حکم دیتا ہے کہ یہ اختیارات، یہ امانات ان لوگوں کے سپرد کرو جو اس کے اہل ہیں۔یہاں ادائے امانت کے الفاظ، اختیارات سپرد کرنے یا ووٹ دینے کے معنی میں استعمال کئے گئے ہیں کیونکہ اس سے اگلی آیت میں حکم ہے کہ حکومت کے فیصلے عدل کے ساتھ کیا کرو۔مشہور اور مستند درسی لغت، مصباح اللغاۃ نے امانت کے معنی فریضۂ خداوندی لکھے ہیں۔قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ خود مملکت یا مملکت چلانے والے اربابِ اقتدار کے پاس جو اختیارات ہوتے ہیں وہ ان کے ذاتی اختیارات نہیں ہوتے لوگ جو اپنے اختیارات ان کے سپرد کرتے ہیں یہ ان کے پاس امانات ہوتے ہیں۔ یہ Trust ہوتے ہیں۔ یہ موجودہ نظام جمہوریت جس میں ہم اپنے ووٹ دیتے ہیں یہ ہم اپنے اختیارات دوسروں کے سپرد کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہونے چاہئیں جو اس کے اہل ہوں قرآن نے اہل کو Define نہیں کیا صرف یہ کہا ہے کہ ایسے لوگ چاہئیں کہ ان کے ہر کام میں عدل وانصاف پایا جاتا ہو۔ ہمارے عوام جن لوگوں کو یہ امانات سپرد کرتے ہیں، وہ لوگ عموماً بدسیرت، بدچلن، بددیانت اور لٹیرے ہوتے ہیں۔وہ خود ہی ایک دوسرے کو ننگا کرتے رہتے ہیں اگر قرآنِ کریم کا یہ اہم اصول ہمارے سامنے ہو اور ہم اچھے، پختہ سیرت لوگوں کو اپنی امانات سپرد کریں تو مملکت اس درجہ تباہ حال نہیں ہو سکتی۔

سیکولر حکومتوں میں احکامات کی اطاعت وہاں ہی ہوتی ہے جہاں لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ حکام ان کو دیکھ رہے ہیں۔

ٹریفک سگنل کی اطاعت جب تک ہوتی ہے جب تک ڈرائیور کو پکڑے جانے کا خوف ہوتا ہے اگر ڈرائیور کو پکڑے جانے کا خوف نہیں ہوتا تو وہ Red light ہونے کے باوجود سگنل کو عبور کر جاتا ہے۔ کیونکہ اس وقت اس کو کوئی دیکھتا نہیں۔ آیت کے آخر میں ارشاد ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝ (4:58)، اللہ سننے اور دیکھنے والا ہے یہ معنی ہیں کہ اسلامی مملکت اللہ کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے۔ سیکولر نظام میں جو ڈرائیور ٹریفک سگنل کی خلاف ورزی کرتا ہے اسے صرف نظام کی خلاف ورزی کا خوف ہوتا ہے۔ اگر اس نے ایسا بندوبست کر لیا کہ اس نظام میں اس کو ٹریفک سگنل کی خلاف ورزی پر کوئی جرمانہ نہیں ہوتا تو وہ یہ جرم کرتا رہے گا۔ لیکن ریاستِ مدینہ میں ڈرائیور اللہ و رسول ﷺ کے ہاں جوابدہ ہوتا ہے اس کا اللہ و رسول ﷺ کے ہاں مواخذہ ہوتا ہے۔ اس کے نفس پر اس خلاف ورزی کا ایک بُرا اثر پڑتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ سیکولر نظام میں جرائم کا انسداد نہیں ہوسکتا لیکن ریاستِ مدینہ میں جرائم کا ارتکاب اس لئے نہیں ہوتا کہ انہیں معلوم ہے کہ اللہ سمع و بصر ہے اور ان جرائم کو دیکھ رہا ہے۔ ریاستِ مدینہ کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ اس میں جرائم کا ارتکاب نہیں ہوسکتا۔

(2) ریاستِ مدینہ کا دوسرا اصول باہمی مشورہ کرنا ہے۔ قرآنِ کریم میں دو مرتبہ اس کا ذکر آیا ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں ذکر ہے کہ مومنین اپنے کام آپس میں مشورے سے کرتے ہیں (42:38) اور سورہ آل عمران میں حضور ﷺ کو حکم ہے کہ اہم امور میں صحابہؓ سے مشورہ کر لیا کریں (3:159) حضور ﷺ مہمات امور میں برابر صحابہؓ سے مشورہ فرماتے تھے۔ اور صحابہؓ آپس میں مشورہ کرتے تھے۔ حروب وغیرہ کے متعلق بھی اور بعض احکام و مسائل کی نسبت بھی۔ ریاستِ مدینہ کی اساس ہی شوریٰ پر قائم تھی۔ ظاہر ہے کہ مشورہ کی ضرورت ان کاموں میں ہوتی تھی جو مہتمم بالشان اور اہم ہوں اور جو قرآن میں منصوص نہ ہوں۔ جو چیز قرآن کریم سے منصوص ہو اس میں رائے اور مشورہ کے کوئی معنی نہیں۔ آپ اس بات پر غور فرمائیں کہ 1400 سال پیشتر دنیا میں کسی بھی سیاسی نظام میں مشاورت کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ ملوکیت میں تو مشورہ کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ اُس زمانہ میں ملوکیت اور مشاورت دو متضاد تصورات تھے۔ جو اسلامی نظام ہوتا ہے اس کی بنیاد یہ ہے کہ وہ مشورہ سے قائم ہو، اور اہم معاملہ میں امت سے مشورہ لیا جائے۔ جب اس میں رسول اللہ ﷺ خود مستثنیٰ نہیں تھے، تو اس سے کوئی ہستی مستثنیٰ نہیں ہوسکتی۔

ہر چند کہ رسول اللہ ﷺ کا مقام بہت بلند تھا۔ مومنین ان کی نبوت پر ایمان لاتے ان کے فیصلوں کو اس طرح تسلیم کرتے تھے کہ: لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا (4:65) ان کے کسی فیصلے کو تسلیم کرنے میں دل میں کوئی گرانی محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس بلند اور عالی مرتبہ کے باوجود اُن کو مشورہ کرنے کا حکم تھا قرآن نے جو فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ مومنین کی صلاحیتوں کو نشوونما دیتے تھے وَيُزَكِّيْهِمْ (3:164) تو اس طرح مشورہ کرنے سے حضور ﷺ ان کی صلاحیتوں کو نشوونما دیتے تھے۔ ریاستِ مدینہ کے ہر سربراہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں سے حکومت چلانے کے بارے میں مشورہ کرتا رہے۔ اور ان کی صلاحیتوں کو نشوونما دیتا رہے۔

(3) قرآنِ کریم ریاست مدینہ کے لئے بدنی سزائیں مقرر کرتا ہے۔ کیونکہ سیکولر ریاستوں میں تو مجرم کو تو جیل خانے

میں قید کر دیا جاتا ہے جہاں اس کی اپنی بنیادی ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن اس کے اہلِ خانہ چھوٹے چھوٹے بچے بھوکے رہتے ہیں۔ جرم تو ایک شخص کا ہوتا ہے لیکن اس کی سزا اس کے گھر والے، جو بالکل بے قصور ہوتے ہیں وہ برداشت کرتے ہیں اصل بات یہ ہے کہ قید کی سزا مجرم کو جرم سے نہیں روک سکتی۔ ہمارا روزمرہ کا تجربہ ومشاہدہ ہے کہ ہمارے بڑے بڑے سیاسی لیڈر، جو حکومت کے بڑے عہدوں پر بھی فائز رہے ہیں انہیں بڑی لمبی لمبی سزائیں ملیں لیکن چونکہ انہیں قید خانہ میں ہر طرح کی آسائشیں فراہم تھیں۔ اُنہیں یہ سزا مزید ارتکابِ جرائم سے نہیں روک سکی۔ وہ خوف جس سے مجرم ارتکاب جرم سے باز رہتا ہے وہ خوف قید کی سزا سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ وہ خوف صرف بدنی سزا سے پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے یہ بددیانت اور لٹیرے لیڈر، اگر حکومت ان کو بدنی سزا دیتی تو پھر یہ ملک کو اس طرح نہ لوٹتے۔ کہ ہر طرف لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ حکم دیا وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ (24:2)، سزا دینے میں نرمی نہ برتو۔ کیونکہ یہ عدل کا معاملہ ہے۔ اس میں ججوں کے ذاتی جذبات کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہئے۔

(4) ریاست مدینہ کا چوتھا اصول احترام آدمیت ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝ (17:70) ترجمہ: اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور خشکی اور تری دونوں میں ان کو سواری دی اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا اور ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فضیلت دی۔ یعنی انسان کو حسنِ صورت نطق، تدبیر عقل وحواس عنایت کئے جن کے سبب وہ دنیا اور آخرت کے مفاد اور منافع میں تمیز کر سکتا ہے۔ اچھے اور بُرے میں تفریق کر سکتا ہے۔ ہم نے انسان کے لئے ہر طرف ترقی کی راہیں کشادہ کیں۔ انسان دوسری مخلوق کو مسخر کر کے اس سے طرح طرح کی خدمت لیتا ہے۔ خشکی میں جانوروں کی پشت پر یا دوسری طرح کی گاڑیوں میں جوت کر، ان پر سفر کرتا ہے اور سمندر کو کشتیوں اور جہازوں کے ذریعے بے تکلف طے کرتا ہے۔ فضائے آسمانی میں ہوائی جہازوں کے ذریعے ہزاروں میل کا سفر چند گھنٹوں میں طے کر لیتا ہے۔ طرح طرح کے عمدہ کھانے، کپڑے، مکانات، دنیوی آسائش وآرام وسامانوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ جتنے بھی بنی آدم ہیں، انسانی بچے ہیں۔ اُنہیں ہم نے واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ جنہیں بنیادی حقوق انسانیت کہا جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ لوگوں نے دوسروں کے چھینے ہیں لیکن قرآنِ کریم نے اُنہیں سرفہرست رکھا ہے۔ یعنی انسان کا صرف انسان ہونا ہی واجب العزت ہے۔

آدمیت احترام آدمی با خبر شواز مقام آدمی

قرآنِ کریم نے ایک انسان کے قتل کو ساری انسانیت کے قتل کے برابر قرار دیا ہے۔ ریاستِ مدینہ ہر انسان کے احترام کو سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ ریاستِ مدینہ کی اساس چونکہ مستقل اقدار پر ہوتی ہے اور احترام آدمیت ان اقدار میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے ریاستِ مدینہ میں ہر شخص کا احترام واجب ہو جاتا ہے۔ اس قدر کو کسی مفاد اور مقصد کی خاطر چھوڑا نہیں جا سکتا۔ اس سے ذات پات، حسب نسب، رنگ ونسل کے تمام امتیازات ختم ہو جاتے ہیں (49:13)

قرآن تو پوری نوعِ انسانی کو خطاب کر کے کہتا ہے خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (4:1) ترجمہ: ہم نے تم سب کو ایک نفس واحدہ سے پیدا کیا ہے نیز پیدائش کے اعتبار سے مرد اور عورت کو بھی ایک ہی درجہ و مقام حاصل ہے۔

(5) اگرچہ تمام انسان ایک طرح سے ہی واجب الاحترام ہیں۔ لیکن ریاست مدینہ میں اس سے بڑھ کر احترام کا مقام اس کے اعمال کے مطابق مقرر ہوتا ہے وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (46:19) ہر شخص کا مرتبہ اس کے اعمال کے مطابق مقرر ہوتا ہے۔ جو سب سے زیادہ اطاعت خداوندی کرتا ہے اس کا مرتبہ سب سے بلند ہوتا ہے اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ (49:13) تم میں سب سے زیادہ قابل احترام وہ ہے جو سب سے زیادہ ریاست مدینہ کی اطاعت کرتا ہے۔ ہمارے ہاں جو Services میں کوٹہ سسٹم ہے، کہ فلاں سروس میں اس صوبہ سے اتنے افسران لئے جائیں گے اور دوسرے صوبہ سے اتنے فیصد اس طرح Merit نظر انداز ہو جاتا ہے۔ یہ قرآن کے خلاف ہے، کیونکہ اس طرح اعمال کے مطابق درجات نہیں ملتے اس لئے یہ پریکٹس قرآن کے خلاف ہے۔

(6) ریاست مدینہ کی بنیادی ذمہ داری تمام افراد معاشرہ کی تمام ضروریات زندگی فراہم کرنا ہوتا ہے۔ اس میں رزق کی فراہمی اولین درجہ رکھتی ہے۔ قرآنِ کریم کی انوکھی اور نادر بات یہ ہے کہ قرآن نے رزق کی ذمہ داری کو انفرادی کی بجائے اجتماعی ذمہ داری قرار دیا ہے۔ ایک مزدور سارے دن محنت کر کے جو کماتا ہے۔ اگر اس کی یہ کمائی کنبہ کے تمام افراد کے لئے رزق مہیا نہیں کرتی تو اس کے لئے مزدور مطعون نہیں ہوتا بلکہ ریاست مدینہ اس کی مطعون قرار دی جاتی ہے جو اس مزدور کے تمام بچوں کو رزق فراہم کرنے کی ذمہ دار ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6) زمین میں کوئی متنفس ایسا نہیں ہے جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔ قرآنِ کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ جب ریاستِ مدینہ میں اللہ تعالیٰ کے قوانین جاری ہوتے ہیں جن کی اطاعت کی جاتی ہے تو ریاست مدینہ ان تمام ذمہ داریوں کو بھی پورا کرتی ہے جنہیں پورا کرنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وعدے ریاست مدینہ کے ذریعے پورے کئے جاتے ہیں۔ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ (6:151) ہم تمہیں اور تمہاری اولاد کو رزق فراہم کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ عربی زبان میں رزق کے معنی صرف خوراک و غذا نہیں ہوتے بلکہ عربی میں رزق کے مفہوم میں ساری ضروریات زندگی آجاتی ہیں۔ رزق کے مفہوم میں جسمانی پرورش اور انسانی صلاحیتوں کو نشوونما دینے کے تمام سامان شامل ہو جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس کے لئے ''زکوٰۃ'' کی بہت جامع اصطلاح استعمال کی ہے۔ ریاستِ مدینہ کا فرض ایتائے زکوٰۃ یعنی تمام نوعِ انسانی کو سامان نشوونما فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الحج میں ارشادِ عالی ہے: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ (22:41) یہ مومنین وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو اقتدار عطا کرتے ہیں تو یہ ریاست قائم کرتے ہیں اور سب عوام کی پرورش کرتے ہیں۔

(7) چونکہ قرآنِ کریم رزق کی ذمہ داری کو انفرادی کی بجائے نظام کی اجتماعی ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ اس لئے اس نظام کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اتنے ذرائع و وسائل بھی ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے موجود ہوں۔ اس

لئے قرآن کریم ذرائع رزق کو بھی انفرادی ہاتھوں میں نہیں رہنے دیتا بلکہ ذرائع نظام کی Disposal پر دے دیتا ہے۔
قرآنِ کریم نے ذرائع رزق کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام ذرائع رزق کو تمام عوام اور تمام انسانوں کے لئے پیدا کیا ہے۔ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۚ (2:29) اللہ وہ ہے جس نے زمین کی ساری پیداوار کو تم سب کے فائدے کے لئے بنایا ہے۔ قرآنِ کریم کے نزدیک زمین کی ملکیت بالکل ناجائز ہے۔ زمین پر کسی کی ملکیت بالکل ناجائز ہے۔ زمین کسی کی ملکیت نہیں ہوسکتی۔ اس کی بیع وشریٰ بھی حرام ہے۔ زمین تو انسانوں کی پیدائش سے پیشتر بھی موجود تھی اس وقت زمین کا مالک اللہ تعالیٰ تھا جس نے اس کو بنایا تھا۔ لوگوں نے اس زمین پر قبضہ کیا۔ لیکن زبردستی قبضہ کرنے سے کوئی چیز اس کی ملکیت میں نہیں آجاتی قرآنِ کریم میں ہے: وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ ؕ (7:10) ہم نے تمہیں زمین میں اقتدار دیا اور اس زمین میں تمہاری ضروریات پوری کرنے کی معیشت رکھی، جو کہ: سَوَآءً لِّلسَّآىِٕلِیْنَ ۝۱۰ (41:10)، یہ سامان زندگی تمام ضرورت مندوں کے لئے برابر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سب لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس کو جمع اور ذخیرہ کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ وَیَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۗ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219)، تم سے دریافت کرتے ہیں کہ اپنی دولت میں سے اپنے لئے کیا رکھیں اور دوسروں کو کتنا دیں۔ ان سے کہہ دو کہ اپنی ضرورت سے جو کچھ بھی زیادہ ہے وہ سب کچھ دوسروں کو دے دو۔ الْعَفْوَ کا ترجمہ تمام مترجمین اور مفسرین نے ''جو کچھ ضرورت سے زیادہ ہو'' کیا ہے۔ سورہ الاعراف میں حضور ﷺ کو حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ خُذِ الْعَفْوَ (7:199) ان کے پاس جو کچھ بھی ان کی ضرورت سے زیادہ ہو اس کو ان سے لے لو۔ اس حکم کا اطلاق ہر اس سربراہِ مملکت پر ہوتا ہے، جو ریاستِ مدینہ کا سربراہ ہو۔ اس آیت میں ضرورت سے زیادہ دولت لینے کی اجازت نہیں ہے بلکہ یہ سربراہِ مملکت کو ایک حکم ہے کہ وہ ہر شخص کی ضرورت سے زیادہ دولت لے کر نظام کے استحکام کے لئے خرچ کرے۔ ہمارے اس دور میں Dams بنانے ضروری معلوم ہو رہے ہیں اور حکومت کو قرضہ جات بھی ادا کرنے کے لئے رقوم کی ضرورت ہے۔ اس لئے اس حکم کی اطاعت کرتے ہوئے، سربراہِ مملکت کا فرض ہے کہ وہ سب لوگوں سے ان کی ضرورت از زائد دولت Aquire کرلے۔

(8) ریاست مدینہ چونکہ ایک آئیڈیالوجی کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے اس لئے جو اس آئیڈیالوجی (اسلام) کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ ایک قوم کے افراد ہوتے ہیں اور جو لوگ اس آئیڈیالوجی کو، اس نظام مملکت کو تسلیم نہیں کرتے، وہ دوسری قوم کے افراد ہوتے ہیں۔ میرا غیر مسلم پڑوسی میری قوم کا فرد نہیں ہے لیکن ترکی یا ہندوستان میں جو مسلمان رہ رہے ہیں وہ میری قوم کے افراد ہیں۔ کیونکہ میری اور ان کی آئیڈیالوجی ایک۔ مقصد حیات ایک ہے۔ نصب العین ایک ہے۔ ریاستِ مدینہ میں غیر مسلموں کو پورے پورے انسانی حقوق حاصل ہوں گے اُنہیں پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی (2:251)، ان کے ساتھ پورا پورا عدل کیا جائے گا ارشادِ عالی ہے: وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ۫

(5:8) ترجمہ: تمہیں کسی قوم کی دشمنی اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم دشمن سے عدل نہ کرو۔ اس کی طرف سے دشمنی کے باوجود عدل کیا کرو۔ یہ چیز تمہیں تقویٰ کے نزدیک کردے گی۔ غیر مسلموں کے ساتھ بہترین سلوک کرنا چاہئے۔ ریاستِ مدینہ میں ان کے بچوں کے لئے بہترین سکول اور کالجز کھولے جانے چاہئیں۔ ان کی آمدنی کے ذرائع کشادہ کرنے چاہئیں۔ اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ غیر مسلموں کی پرستش گاہوں کی حفاظت کرے۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ط (22:40) اگر خدا ایسا انتظام نہ کرتا کہ اگر کوئی قوم ظلم وستم پر اُتر آئے تو کوئی اور قوم ان کی روک تھام کرے تو دنیا میں کسی مذہب کی پرستش گاہ بھی محفوظ نہ رہتی۔ رھبان کی عبادت گاہیں یہودیوں، عیسائیوں کی، مسلمانوں کی مساجد سب منہدم ہوچکی ہوتیں۔ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کی حفاظت کرنے کے علاوہ قرآن کریم کہتا ہے کہ: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ط (6:108) تم غیر مسلموں کے معبودوں کو گالی نہ دو، ایسا نہ ہو کہ وہ تمہارے معبود یعنی اللہ تعالیٰ کو گالی دینے لگیں۔ اس سے فساد برپا ہوگا۔ اس لئے تم ان کے بزرگوں کے بارے میں کوئی گستاخی نہ کرو۔ پبلک امور میں ان پر اسلامی مملکت کے قوانین کا نفاذ ہوگا۔ البتہ ان کی ذاتی زندگی، نجی اور پرائیوٹ زندگی میں ان کے اپنے پرسنل لاز ہوں گے۔ جن میں اُنہیں پوری آزادی حاصل ہوگی۔

ان تمام حقوق حاصل ہونے کے بعد بھی اگر کوئی غیر مسلم ریاستِ مدینہ سے دوسری جگہ جا کر آباد ہونا چاہئے تو اسے اس کے محفوظ مقام تک پہنچانے کی ذمہ داری ریاستِ مدینہ پر ہوتی ہے۔ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ (9:6)، ترجمہ: اور اگر مشرکین میں سے کوئی تمہارے پاس پناہ لے، تو اس کو پناہ دیدو یہاں تک کہ وہ کلام اللہ سن لے۔ پھر اگر وہ کہیں اور جگہ جانا چاہے تو اسے اس کی امن کی جگہ پہنچا دو اس لئے کہ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ ریاستِ مدینہ میں زندگی بسر کرنے کے کیا کیا فوائد ہیں۔

(9) ہمارے بنو عباس کے دور میں جب قوانین مرتب کئے گئے تو وہ بڑا استبداد اور ملوکیت کا دور تھا۔ تاریک ترین دور تھا۔ وہ تمام قوانین ملوکیت کے زیر اثر اور اس کی حفاظت کے لئے وضع کئے گئے تھے۔ اس لئے ان قوانین کو فقہ اسلامی یا شریعت اسلامی کہنا ہی غلط ہے۔ ان کا اسلام سے دور دور سے کوئی تعلق نہیں۔ اس دور میں جملہ حقوق بحقِ ملوکیت محفوظ تھے۔ رعایا اپنے حق کی حیثیت سے کوئی حق طلب نہیں کرسکتی تھی۔ اس میں مردوں کے ہی حقوق نہیں تھے۔ تو عورتوں کے حقوق کس طرح ہوسکتے تھے عورتوں کے حقوق نہ دینے میں عیسائیت کا بہت بڑا کردار ہے۔ عیسائیت میں عورتوں کے متعلق بہت نفرت انگیز تصور تھا۔ عیسائیت کا عقیدہ یہ ہے کہ عورتیں ہی تمام گناہوں کا سرچشمہ ہیں۔ کیونکہ آدم کو جنت سے نکلوانے کا سبب ہی عورت بنی تھی۔ عورتوں کے حقوق کا موضوع بہت طویل ہے۔ ہم نے صرف ان اسباب کی نشاندہی کی ہے جن کی وجہ سے عورتوں کے حقوق پامال کئے گئے تھے۔ ان اسباب کو پیش نظر رکھ کر، ان اسباب سے اجتناب کرتے ہوئے، اور سابقہ وضع شدہ قوانین کو بالکل رد کے، عورتوں کے حقوق قرآنِ خالص کی روشنی میں موجود دور کی ضروریات کے مطابق مدون کئے جائیں

جو موجودہ دور کے تقاضوں کو بھی پورا کر سکیں۔ تحریک طلوعِ اسلام نے اس سلسلہ میں بہ حد کفایت کام کیا ہوا ہے۔ ریاست مدینہ کو اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہئے۔

(10) چونکہ ریاستِ مدینہ اللہ تعالیٰ کے نام پر اور اس کے Behalf پر قائم کی جاتی ہے اس لئے ریاست مدینہ اللہ تعالیٰ کہ ذمہ داریاں پوری کرتی ہے۔ اس لئے بھی جب کہ ریاست مدینہ اپنے شہریوں سے اللہ کے قوانین کی اطاعت کراتی ہے تو شہریوں کے متعلق جن ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی ضمانت اللہ نے دی ہے، وہ ضمانت ریاستِ مدینہ پورا کرتی ہے۔ عام سیکولر حکومتوں سے ریاستِ مدینہ کا مابہ الامتیاز فرق یہ ہوتا ہے کہ سیکولر حکومتیں خود مقصود بالذات ہوتی ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک ایسا بہترین معاشرہ تشکیل دیں جس میں امن وامان ہو۔ تمام شہریوں کی ضروریات پوری ہو رہی ہوں۔ اگر ایسا معاشرہ قائم ہو جاتا ہے تو وہ کامیاب ریاست ہے۔ اور حقیقت میں بھی یہ بہت بڑی کامیابی ہے اور اس ریاست نے اپنا مقصد بھی پورا کر دیا۔ لیکن ریاست مدینہ خود مقصود بالذات ریاست نہیں ہوتی۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ مملکت افراد کی انفرادیت کا تحفظ کرتی ہے اور اس کے قوانین کی اطاعت سے نفس انسانی کی نشوونما ہوتی ہے۔ ریاست مدینہ کے قیام کا مقصد تمام افراد کی ذات کی خودی کی پرورش کرنا ہوتا ہے۔ اس ریاست میں یہ مقصد اس لئے حاصل ہوتا ہے کہ اس میں قوانین خداوندی کی اطاعت ہوتی ہے۔ باطل پر قائم شدہ مملکت خود ہی انسانی ذات کے استحکام میں ایک رکاوٹ ہوتی ہے۔

سورۂ توبہ میں ارشادِ عالی ہے: وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (9:100) مہاجرین وانصار میں پیش قدمی کرنیوالوں اور ان کی پیروی کرنیوالوں سے خدا خوش ہے اور وہ بھی خدا سے راضی ہیں۔ اس آیۂ کریمہ کی تفسیر کے ذیل میں تفسیرِ مظہری میں مرقوم ہے کہ: وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ کے متعلق علماء نے لکھا ہے جتنے لوگ سابقین اولین کے علاوہ دوسرے انصار ومہاجرین ہیں اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو قیامت تک سابقین اولین کی راہ پر چلیں گے یعنی ہجرت اور اقامتِ دین کی کوشش کریں گے۔ یعنی جو لوگ اقامت دین کریں گے اُن کا مرتبہ وہ ہی ہوگا جو حضور ﷺ کے ساتھیوں کا ہے۔

اسی آیت کے ذیل میں تفسیر نمونہ میں ہے ''بلکہ تابعین باحسان کی تعبیر ان سب کے لئے ہے جنہوں نے کسی زمانے میں بھی سابقین اولین کے اہداف ومقاصد کی پیروی کی۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ بعض لوگوں کی سوچ کے برعکس نصرت وہجرت دونوں اسلام کے اصلاحی اور تعمیری مفاہیم ہیں جو زمانۂ پیغمبر میں محدود نہیں بلکہ آج بھی یہ دونوں مفاہیم دوسری صورت میں موجود ہیں اور کل بھی ان کا وجود ہوگا۔ اس بنا پر وہ تمام افراد جو کسی نہ کسی طرح ان دونوں پروگراموں پر عمل پیرا ہوں گے تابعین باحسان کے مفہوم میں داخل ہوں گے'' (اقتباس ختم)

اس آیت میں ارشادِ کیا گیا ہے کہ جو حضرات جب بھی اور کہیں بھی اقامت دین کی کوشش کریں گے ان کو حضور کی رفاقت کا شرف حاصل ہوگا۔

محمد علی صابر صدیقی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نشست نمبر 1

نوجوانوں کا صفحہ

نخلِ سینا

صبح کا وقت ہے اور سردی کا موسم چھڑا چھڑ بارش کی جلترنگ بج رہی ہے۔ کلیم الزمان زبیری حسب معمول اپنی نماز اور ورد و وظائف کے بعد ڈائننگ روم میں کمبل اوڑھے ناشتے کا انتظار کر رہے ہیں۔ بیگم حلیمہ کلیم ناشتے کا سامان اٹھا کر کمرے میں داخل ہوتی ہیں اور ساتھ ہی کلیم صاحب کا چھوٹا بیٹا شکیل الزمان چھینکتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ اپنی برساتی ایک کھونٹی پر ٹانگ کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ اپنے والد کی استفہامیہ نگاہوں کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے۔

شکیل الزمان (بیٹا): ابو! اوپر کتے اور بلیاں لڑ رہے ہیں۔ گھمسان کا رن پڑا ہوا ہے، برساتی کے باوجود بھیگ گیا ہوں کپڑے بدل کر آتا ہوں۔

کتے بلیوں کی جنگ کا سن کر حلیمہ بول اٹھتی ہیں کہ اس بارش میں کتے بلیاں نگوڑی کہاں سے آ گئیں جس پر کلیم الزمان مسکراتے ہوئے بیگم سے کہتے ہیں۔ حلیمہ بیگم صاحبہ! آپ سے سو بار کہا ہے کہ تھوڑی سی انگریزی سیکھ لیں کام آئے گی۔ آپ تو جانتی ہیں کہ شکیل کا طرز گفتگو کیا ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ اُسے انگریزی میں کہتے ہیں، ''Its raining cats & dogs'' کلیم الزمان پھر شکیل کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم جانتے ہو کہ موسم سرما شروع ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود تم احتیاط نہیں برت رہے۔ آخر بارش میں چھت پر جانے کی کیا ضرورت تھی۔ الماری میں "ڈلکا مارا" رکھی ہے چند گولیاں منہ میں ڈال لو۔

شکیل الزمان (بیٹا): ابو! میرا بیٹ چھت پر رہ گیا تھا۔ زیادہ بارش کی وجہ سے وہ بہہ کر پرنالے میں جا اٹکا جس کی وجہ سے پرنالہ بند ہو گیا اور چھت تالاب بنتی جا رہی تھی۔ پرنالہ کھولنا ضروری تھا۔

کلیم الزمان (سربراہ): پرنالہ کھولنا ضروری تھا، بہت اچھا کیا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری کرکٹ نے تو پوری قوم کا پرنالہ بند کر رکھا ہے۔ میچ فکسنگ کی وجہ سے کئی کھلاڑیوں کو برطانیہ میں جیل جانا پڑا۔ پوری دنیا میں پاکستان کی جگ ہنسائی

ہوئی۔ پھر کھلاڑیوں پر طرح طرح کے الزام لگ رہے ہیں، کہیں وہ نائٹ کلبوں میں ڈانس کر رہے ہیں، کہیں حسیناؤں کو بغل میں دبائے دیکھے گئے ہیں۔

شکیل الزمان، کلیم صاحب کا چھوٹا بیٹا اور لاڈلا ہونے کی وجہ سے وہ اپنے والد سے کبھی کبھی الجھ بھی پڑتا ہے چنانچہ اس نے کرکٹ اور کرکٹ کے کھلاڑیوں کا دفاع کرتے ہوئے ان کی تعریفوں کے پل باندھنا شروع کر دیئے کہ ہمارے کھلاڑی چھکے مار مار کر ملک وقوم کا نام روشن کر رہے ہیں۔ کلیم صاحب جہاندیدہ انسان ہیں لہذا انہوں نے شکیل کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے ایک تاریخی جملہ کہہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ بیٹے سنو! جس قوم میں گفتار و کردار کی ہمہمی اور کارگزاری کی گہما گہمی، ڈائریکٹریٹ آف ایجوکیشن سے شفٹ ہو کر ڈائریکٹریٹ آف کرکٹ بورڈ میں چلی جائے تو اس قوم کے مستقبل کا خدا ہی حافظ ہو سکتا ہے۔

باپ بیٹے میں یہ بحث ہو رہی تھی کہ کلیم صاحب کے بڑے بیٹے عقیل الزمان ڈائننگ روم میں داخل ہوئے۔ عقیل الزمان نے اپنے والد کی طرح وکالت کا پیشہ اختیار کیا تھا اور اس کے لباس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کورٹ میں جانے کے لئے پوری طرح تیار ہو کر آیا ہے لیکن ان کی بیگم عالم آرا معمولی لباس پہنے تھی۔ عالم آرا نے اسلامیات میں ایم اے کر رکھا تھا اور وہ کسی سکول میں پڑھاتی ہیں۔

جب عقیل اور عالم آرا اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو کلیم صاحب نے عالم آرا کی ہیئت کذائی دیکھ کر کہا۔

کلیم الزمان (سربراہ): بیٹی عالم آرا! اگر میں تمہیں کوئی بات کہوں تو برا تو نہیں مانو گی؟

عالم آرا (بہو): نہیں ابو آپ کہیں۔ برا ماننے کی کیا بات ہے۔

کلیم الزمان: میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تمہارا نام عالم آرا ہے۔ تم خود آرائی نہیں کر سکتیں۔ عالم آرائی کیا کرو گی۔ اپنی حالت دیکھو اور اپنے کمرے کی حالت دیکھو۔

اپنے والد کو غصے میں دیکھ کر عقیل نے کہا کہ ابو میں نے سو دفعہ ان سے کہا ہے کہ صبح صبح۔ اس پر عقیل کی بات کاٹتے ہوئے کلیم صاحب نے کہا کہ عقیل! چپ رہو۔ ہم اپنی بیٹی سے بات کر رہے ہیں۔ اس پر عالم آرا نے کہا کہ دراصل بات یہ ہے کہ میں انتظار کر رہی تھی کہ شبو آ جائے تو اس سے کمرہ صاف کروالوں۔ مجھے بھی ساتھ کچھ کام کرنا پڑے گا، میرا ارادہ ہے کہ کچھ اڑوس پڑوس کی بچیوں کو بلا کر ختم قرآن کا بندوبست کروں۔

کلیم الزمان (سربراہ): اچھا خیال ہے مگر مجھے ختم قرآن کی اصطلاح سے اتفاق نہیں۔ معلوم نہیں کس ستم ظریف نے یہ اصطلاح گھڑی ہے کہ ختم قرآن کر کے قرآن مجید کے احکام کو بالکل ختم ہی کر دیا گیا ہے۔

عالم آرا (بہو): ابو! وہ کیسے؟

کلیم الزمان (سربراہ): یہ ایک لمبا موضوع ہے۔ اس پر کسی اور وقت گفتگو کریں گے فی الحال میں تمہیں ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ تم شبانہ بی بی کو شبو کہہ کر نہ بلایا کرو۔ اسے ہمیشہ اس کے پورے نام سے مخاطب ہوا کرو۔ یہ مقسوم کا پہیہ بھی عجیب ہے کبھی ادھر گھومتا ہے اور کبھی ادھر۔ مغلوں نے ہندوستان میں کئی سو سال حکومت کی، اسوقت مغل اور مغلانی بڑے باعزت الفاظ تھے لیکن پھر گردش فلک نے دیکھا کہ گھر کی نوکرانی کو مغلانی کہا جانے لگا۔ ہمیں معلوم ہے کہ شبانہ بی بی کے دل و دماغ پر نوکرانی ہونے کی وجہ سے کس قسم کے خیالات اور جذبات کا پہرہ ہوگا ہوسکتا ہے کہ اس نے کبھی اچھے دن دیکھے ہوں اور اب نوکری کرنے پر مجبور ہوگئی ہو۔ تمہارے ختم قرآن کے متعلق تو کسی اور وقت گفتگو ہوگی فی الحال میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ عالم آرائی سے خود آرائی پہلے ہونی چاہیے۔

عالم آرا (بہو): ابو! آپ نے ختم قرآن کو اصطلاح کہہ کر مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔

کلیم الزمان (سربراہ): بیٹی! اگر میں نے ختم قرآن پر گفتگو شروع کر دی تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ ہم تو ختم قرآن اسی وقت کرتے یا کراتے ہیں جب کسی کے ہاں اولاد نرینہ کی خواہش ہو، یا کوئی وفات ہو جائے، یا کسی مصیبت سے چھٹکارا مقصود ہو، یا خدا تعالیٰ سے کچھ حاصل کرنا ہو، یہاں ایک لطیفہ کی بات یاد آ گئی جو ہمارے ایک دوست نے سنایا تھا۔ پاکستان فضائیہ کے ایک سٹیشن کمانڈر صاحب نے ختم قرآن کا حکم دیا۔ شائد ان کی پروموشن کا معاملہ اٹکا ہوا تھا۔ ایسے کاموں کے لئے افواج میں ایجوکیشن افسر کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ بات چلتے چلتے وارنٹ آفیسر پر آٹھہری جو اپنا فالتو وقت زیادہ تر مسجد میں گزارتے تھے۔ ان کو حکم دیا گیا کہ ختم قرآن کا بندوبست کرو۔ محفل میں اوسی ایڈمن ونگ موجود تھے۔ وارنٹ آفیسر نے ان سے کہا کہ مٹھائی کے لئے کچھ رقم Recommend کر دیں۔ اس پر اوسی ایڈمن صاحب نے نہایت ترش لہجہ میں فرمایا کہ مٹھائی کی کیا ضرورت ہے کیا مٹھائی کے بغیر ختم قرآن نہیں ہوسکتا؟ صحابہؓ کے زمانے میں کونسی مٹھائی بٹا کرتی تھی؟ وارنٹ آفیسر نرم مزاج اور ہنس مکھ قسم کے آدمی تھے، ویسے بھی جونیئرز کو افسر صاحبان کے سامنے نگاہیں نیچی ہی رکھنی پڑتی ہیں اور خاص کر افواج میں۔ وارنٹ آفیسر نے نہایت نرم لہجے میں عرض کرتے ہوئے کہا، سر! صحابہؓ کے زمانے میں ختم قرآن ہوا ہی نہیں کرتا تھا۔ اوسی صاحب یہ کہتے ہوئے چلے گئے، اچھا اچھا پی ایس آئی فنڈ سے ایک سو روپیہ جا کر لے لو۔ بیٹی یہ ہے ختم قرآن کی پوزیشن۔ قرآن مجید کے ایک ایک لفظ میں حیات بخش تصورات کی ایک دنیا چھپی ہوئی ہے۔ اس وقت مجھے شکیل صاحب سے کچھ کہنا ہے۔ قرآن مجید پر تم سے پھر کسی وقت بات ہوگی۔ تم جاؤ اپنا کام کرو۔ اس کے بعد کلیم الزمان شکیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ اچھا تو بیٹے یہ بتاؤ کہ کرکٹ کھیلنے والے اپنے ملک کا نام دنیا بھر میں روشن کر رہے ہیں۔ اور میڈیا بھی ان کی بڑی تعریف کر رہا ہے۔ ہماری جوانی کے زمانے میں لوگ اکثر ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو فلم سٹار کہا کرتے تھے۔ آجکل یہ کرکٹ سٹار پیدا ہو گئے ہیں۔

میری نظر میں یہ سٹار نہیں شوٹنگ سٹار ہیں، جو تھوڑی دیر چمک کر غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ کیا تم جانتے ہو کہ مولانا محمد علی جوہر کے بھائی مولانا شوکت علی اپنے زمانے کے مشہور کرکٹ پلیئر تھے۔ کیا تم نے کبھی ڈاکٹر دلاور کا نام سنا ہے کبھی ڈاکٹر جہانگیر کا نام سنا ہے یہ سب اپنے زمانے کے مشہور کھلاڑی تھے اور فضل محمود نے اپنی باؤلنگ سے انگریزی لغت میں ایک لفظ کا اضافہ کر دیا۔ جب اخباروں نے لکھا کہ برطانوی کرکٹ ٹیم فضلڈ آؤٹ ہوگئی لیکن ان سب مشاہیر کو آج بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ آج جو بڑے کھلاڑی تمہیں نظر آ رہے ہیں کچھ عرصہ بعد ان کا بھی وہی حال ہوگا۔ وہ بھی ماضی کے پردے میں غائب ہو جائیں گے۔

شکیل الزمان (بیٹا): ابو! آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ کیا آپ سپورٹس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے؟

کلیم الزمان (سربراہ): ہرگز نہیں۔ بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ کھلاڑی فٹ بالر ہو یا ہاکی پلیئر، ٹینس پلیئر ہو یا کرکٹ پلیئر جب وہ گیم ختم کر کے نہا دھو کر چائے کا ایک پیالہ پیتا ہے تو اس سے زیادہ فرحت بخش لمحہ اور کوئی نہیں ہوتا۔ لیکن یہ فرحت بخش لمحہ اسی وقت میسر ہوتا ہے جب کھیل کو کھیل کے طور پر کھیلا جائے۔ کھیل کو اگر شہرت حاصل کرنے کیلئے کھیلا جائے تو ناکامی کی صورت میں طبیعت میں اضمحلال آ جاتا ہے اور اگر پیسوں کے لئے کھیلا جائے تو طبیعت میں سفلہ پن پیدا ہو جاتا ہے اور لوگ بین الاقوامی شہرت رکھتے ہوئے بھی لالچ کی وجہ سے بجلی چرانے سے باز نہیں رہتے اور ان کی حیثیت رومن زمانہ کے گلیڈی ایٹرز سے زیادہ نہیں رہتی۔

کلیم الزمان (سربراہ): بیٹا! تمہیں بین الاقوامی شہرت مل بھی گئی تو کیا حاصل؟ ایسی شہرت چند سال سے زیادہ قائم نہیں رہتی۔ بعض اوقات سینہ پر شہرت کے تمغے سجانے والوں کو پیٹ پوجا کے لئے گنڈیریاں بیچنا پڑتی ہیں۔ میرے بچپن کے زمانہ میں ہندوستان میں ہی نہیں دنیا بھر میں فٹ بال ٹیم بنگال محمڈنز کا بہت شہرہ تھا لیکن بڑھاپے میں ان کھلاڑیوں کا کیا حشر ہوا وہ کوئی نہیں جانتا۔ سب مٹی کے ڈھیر تلے دبے پڑے ہیں۔

شکیل الزمان (بیٹا): ابو! عمران خان کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟

کلیم الزمان (سربراہ): بیٹا! عمران خان تاریخ میں کرکٹ کی وجہ سے نہیں اپنی انسان دوست فطرت کی وجہ سے زندہ رہے گا۔ لوگ اسے کینسر ہاسپٹل کی وجہ سے اور اسکی تعلیمی سرگرمیوں کی وجہ سے تاریخ کے دامن میں زندہ رکھیں گے۔ اسی طرح ابرار الحق بلو کے گھر کی وجہ سے نہیں بلکہ اس ہاسپٹل کی وجہ سے تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا جو اس نے غریب عوام کیلئے بنایا ہے اور عبدالستار ایدھی نے تو کبھی کرکٹ نہیں کھیلی لیکن پھر بھی دنیا بھر میں ایک سربرآوردہ انسان کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ تم دیکھتے ہو کہ قوم جہالت اور افلاس کے سمندر میں غرق ہے اور ہمارے ہاں دو درجن بلّے بازوں نے پوری قوم کو الو بنا رکھا ہے۔ یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری۔ میں تمہیں تاریخ سے ایک مثال دیتا

ہوں تم نے کبھی سپارٹا کا نام سنا ہے؟

شکیل الزمان (بیٹا): کوئی ایکٹر و یکٹر ہوگا۔ یا کوئی کھلاڑی۔

کلیم الزمان (سربراہ): سنو بیٹا! سپارٹا ایک ریاست کا نام تھا۔ وہ علاقہ جسے اب یونان کہا جاتا ہے۔ وہاں کسی زمانہ میں چھوٹی چھوٹی شہری ریاستیں ہوا کرتی تھیں۔ ان میں ایتھنز اور سپارٹا زیادہ مشہور تھیں اور دونوں ریاستوں میں ہمیشہ چپقلش رہتی تھی۔ سپارٹا کے لوگ کھیل کود، ورزش اور فوجی کارناموں میں دلچسپی لیتے تھے اور ایتھنز کے لوگ علم و ہنر میں منہمک تھے۔ آج سپارٹا کو کوئی نہیں جانتا اور ایتھنز کا نام سقراط۔ افلاطون اور ارسطو کی وجہ سے ہر کسی کی زبان پر ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ انہی فلاسفہ کی وجہ سے لفظ یونان علم و حکمت کا استعارہ بن گیا۔ لیکن ساتھ ہی بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یونان کے جمہور نے اپنے دانشمندوں کی قدر نہیں کی اور سقراط کو سزائے موت دینے کے لئے زہر پینے پر مجبور کر دیا۔ اور اس کی عظمت اخلاق کا کیا کہنا کہ جب اس کے شاگردوں نے اسے بھاگ جانے کا مشورہ دیا تو اس نے اسے بداخلاقی کہہ کر بھاگنے سے انکار کر دیا۔ اس کی عظمت کا قصیدہ کہتے ہوئے کراچی کے ایک نوجوان شاعر نے کہا ہے ؎

اس پیالے میں زہر تھا ہی نہیں ورنہ سقراط مر گیا ہوتا

شکیل! اب تم ہی فیصلہ کر لو کہ تمہارا مستقبل کرکٹ کے میدان میں روشن ہوگا یا تم علم کی بارگاہ میں سر جھکا کر سرفراز ہوگے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم کرکٹ کو کھیل سمجھ کر کھیلو اور اپنا مستقبل علم سے وابستہ رکھو تا کہ کھیل اور علم کے امتزاج سے قوم کا پرنالہ چلتا رہے۔ (جاری ہے)

توجہ فرمائیے!

جن احباب نے ''ماہنامہ طلوعِ اسلام'' رسالہ اپنے نام جاری کرایا ہوا ہے اور ان کو رسالہ ان کے دیئے ہوئے پتہ پر مل رہا ہے ان سے درخواست ہے کہ وہ براہِ کرم اپنا فون نمبر/موبائل نمبر اپنے نام اور شہر کے نام کے ساتھ چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام، محترم اکرم راٹھور صاحب کے درج ذیل نمبر پر ایک میسیج کر کے بھیج دیں یا فون کر کے لکھوا دیں۔

بہت شکریہ

0321-4460787

محمد اکرم راٹھور

چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شرحِ جاوید نامہ شائع ہوگئی!

مفکرِ قرآن غلام احمد پرویز علیہ الرحمتہ کے لیکچرز کی تحریر پر مشتمل اپنے انداز کی منفرد شرح جاوید نامہ شائع ہوگئی ہے۔ بڑے سائز کے 800 صفحات پر مشتمل اِس یکتائے روزگار شرح کی قیمت صرف ایک ہزار روپے ہے۔ ''جاوید نامہ'' کیا ہے اس کے متعلق پرویز علیہ الرحمتہ کی زبانی خود ملاحظہ فرمایئے:۔

''علامہ اقبالؒ کی فارسی کی کتاب ہے ''جاوید نامہ''۔ اگر آپ نوجوانوں کو اسلام کی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو میں یہ عرض کروں گا' مبالغے کی بات نہیں ہے' یہ ایک کتاب ''جاوید نامہ'' پڑھا دیجئے لیکن اس کے پڑھانے کے لیے ایسے لوگوں کی یا ایسے شخص کی ضرورت ہوگی جو علومِ حاضرہ کے اوپر پوری دسترس رکھتا ہو۔ یہ بڑی جامع کتاب ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ اقبالؒ کی فکر کا شاہکار ہے۔ تاریخ عالم پہ نگاہ' مذاہبِ عالم پہ نگاہ' سارے فلسفے کے اوپر نگاہ' الٰہیات کے اوپر نگاہ' سوشیالوجی کے اوپر نگاہ' تمدن کے اوپر نگاہ' نظام کے اوپر نگاہ' سب سے بڑی یہ چیز کہ قرآن کی گہرائیوں کے اوپر بڑی نگاہ۔ اگر کہیں یہ چیز نصاب کی اس انداز سے سامنے آئے پھر آپ دیکھئے گا کہ انہی نوجوانوں کی ذہنیت کیسے بنتی ہے اور کیا بنتی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ کوئی دوسری قوم آئے گی۔ بڑا حسین انداز ہے۔ اقبال کے الفاظ ہیں وہ اس انداز سے بات شروع کرتا ہے کہ یہ نظام آیا تو ملوکیت بھی گئی اور یہ پاپائیت بھی گئی اور سرمایہ داری بھی گئی یہ سب چیزیں انہوں نے اُڑا دیں۔ میرے دل کے اندر جو بات چھپی ہوئی ہے آج میں اسے بے نقاب کہہ دینا چاہتا ہوں۔ الفاظ نہیں مل رہے یہ کہنے کے لیے کہ میں کیا کہوں کہ یہ قرآن ہے کیا' یہ کتاب تو نہیں کچھ اور ہی ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب جان کے اندر کسی کے یہ اتر جاتی ہے تو جان بدل جاتی ہے اور جب جان بدل جاتی ہے تو دنیا بدل جاتی ہے''۔

(بحوالہ دروس القرآن سورۃ المائدہ آیات 51 تا 56)

منگوانے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور۔54660، پاکستان
فون: 042-35714546 idarati@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بچوں کا صفحہ

گواہی

میر ناصر اور میر نادر دو بھائی تھے۔ بڑے اچھے اور بڑے پیارے۔ ان کے والد میر سرفراز کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ ان کی اچھی خاصی جائیداد تھی۔ کئی مکان اور کئی دکانیں۔ اِن کا کرایہ آتا اور یہ لوگ مزے سے زندگی بسر کرتے۔ مگر ایسے لوگ، جو محنت مشقت نہیں کرتے اور دوسروں کی کمائی یا باپ دادا کی جائیداد پر گزر بسر کرتے ہیں، بڑے سست ہوجاتے ہیں۔

میر ناصر نے تو شوق سے تعلیم حاصل کی مگر میر نادر کو پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بچے تھے تو ہر وقت پتنگ اُڑایا کرتے، کرکٹ کھیلتے، لٹو گھماتے اور بڑے ہوئے تو دوستوں کے ساتھ کبھی شکار پر جا رہے ہیں تو کبھی سارا دن ٹیلیویژن پر میچ دیکھ رہے ہیں۔

ایک دن ان کے والد میر سرفراز کا انتقال ہوگیا۔ میر ناصر اور میر نادر دونوں جوان تھے۔ جب جائیداد کی تقسیم شروع ہوئی تو کچھ باتوں پر جھگڑا ہوا اور دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہوگئے۔

ان کی جائیداد میں ایک باغ بھی تھا۔ اس کا بھی بٹوارہ ہوگیا۔ امرود اور جامن کے پیڑ میر ناصر کے حصے میں آئے اور آم کے درخت میر نادر کو مل گئے۔

ایک دن میر ناصر اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ باغ میں جا پہنچے اور میر نادر کے درختوں سے آم توڑ توڑ کر کھانے لگے۔ اتفاق کی بات کہ میر نادر بھی اپنے دوستوں اور نوکروں کے ساتھ وہیں پہنچ گئے۔ کچھ نہ پوچھو کہ پھر کیسی تو تو میں میں ہوئی۔ بات جھگڑے تک پہنچی۔ آپس میں لاٹھیاں چل گئیں۔

میر ناصر تھانے پہنچے اور وہاں جھوٹی رپورٹ لکھوادی کہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ جامن اور امرود کے باغ میں بیٹھا تھا کہ میرے بھائی نے آکر اچانک حملہ کردیا اور بہت مار پیٹ کی۔ رپورٹ لکھ لی گئی اور عدالت میں مقدمہ شروع ہوگیا۔ دونوں نے بہت سے جھوٹے گواہ تیار کر لئے جو قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر جھوٹی گواہیاں دینے لگے۔

ایک صبح جب میر ناصر مقدمہ کی پیشی کے لئے عدالت جانے والے تھے تو مقدمہ جیتنے کی دعا کرنے کے لئے قرآن شریف کھول کر بیٹھ گئے۔ اتفاق دیکھو کہ قرآن شریف کی یہ آیت ان کے سامنے آگئی جس میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے:

''اے ایمان والو! تم ہمیشہ انصاف پر قائم رہو اور اللہ کے لئے سچی گواہی دو خواہ اس میں تمہارا، تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔''

یہ پڑھنا تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ سوچنے لگے کہ توبہ توبہ! میں نے اس مقدمہ کے سلسلے میں کتنے جھوٹ بولے ہیں۔ عدالت پہنچے تو انہوں نے جج صاحب سے کہا: ''جناب والا! میں یہ مقدمہ واپس لینا چاہتا

ہوں اور اپنے بھائی سے صلح صفائی کرنے کے لئے تیار ہوں۔''

جج صاحب نے کہا: ''میں آپ کی بات مان لیتا ہوں مگر یہ بتایئے کہ آپ نے یہ فیصلہ کیوں کیا؟''

میر ناصر نے جج صاحب کو پوری بات بتادی اور کہا کہ قرآن شریف کی ایک آیت نے آج سے میری پوری زندگی بدل دی ہے۔ جج صاحب بہت خوش ہوئے اور بولے کہ آپ کی سچائی کی وجہ سے آپ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی ورنہ عدالت کو دھوکہ دینے کی کوشش اور جھوٹی گواہیاں پیش کرنا جرم ہے۔

عدالت سے نکلے تو میر نادر اُن کے گلے سے لپٹ کر کہنے لگے:

''بھائی جان! سارا باغ آپ کا ہے۔''

دونوں بھائی ایک بار پھر پیار محبت سے رہنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ باغ اور جائیداد کو بیچ دیا جائے تاکہ آئندہ ان کے بچوں میں لڑائیاں نہ ہوں اور کہیں وہ بھی سست اور نکمے نہ بن جائیں۔ جائیداد بیچ کر دونوں نے تجارت شروع کی۔ اب سارا شہر ان کی ایمانداری کی قسمیں کھاتا ہے۔

کوئی دعویٰ نہیں

کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں۔ میں نے قرآنِ کریم کو اپنی بصیرت کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اسی فکر پر اس تحریک کی بنیاد رکھی ہے میری یہ فکر میری تحریروں میں محفوظ ہے اور انہی تحریروں کا میں ذمہ دار ہوں۔ اگر کوئی شخص کوئی ایسی بات میری طرف منسوب کرے جو میری تحریروں میں نہیں، تو اس بات کو نہ کوئی سند حاصل ہوسکتی ہے نہ میں اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہوں، خواہ وہ شخص مجھ سے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو۔ میں نے اس وارننگ کو اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ سلسلہ ابھی سے شروع ہوگیا ہے۔ اس زمرہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو باتیں تو اپنی طرف سے کرتے ہیں، اور منسوب کردیتے ہیں۔ انہیں تحریک طلوعِ اسلام کی طرف، وہ دانستہ ایسا کرتے ہوں یا نادانستہ، دونوں صورتوں میں اس سے تحریک کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ تحریک کیلئے سند صرف وہ تحریریں ہیں جو اس کی طرف سے شائع ہوئی ہیں، نہ کہ زبانی روایات خواہ راوی کتنے ہی ثقہ کیوں نہ ہوں میری درخواست ہے کہ آپ احباب اس کا بھی خاص طور پر خیال رکھیں۔

(پرویزؔ، سالانہ کنونشن، 17 تا 20 مارچ 1966ء)

توجہ فرمائیں!

ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور اکتوبر کے چوتھے ہفتے میں سالانہ کنونشن کا انعقاد کررہا ہے۔ اراکین و متفقین سے گذارش ہے کہ اپنے اپنے علاقہ کی بزم ہائے طلوعِ اسلام سے رابطہ کریں۔

(چیئرمین ادارہ)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(قسط نمبر 31)

دو قومی قرآنی نظریہ پر مطالبۂ پاکستان

آٹھواں باب:

انسانی ذات کی نشوونماء کا حدِ بشریت میں نمودِ صفاتِ خداوندی سے قُرب کا معیار

32۔ المومن:

مومن، امن کی ضمانت دینے والے کو کہتے ہیں۔ جس پر بھروسہ کر کے انسان بے فکر اور محفوظ ہو جائے۔ قرآن نے سورۃ الحشر کی آیت 23 میں خدا کی مختلف صفات کا ذکر کرتے ہوئے ایک صفت المومن بھی بتائی ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلۡمَلِكُ الۡقُدُّوۡسُ السَّلٰمُ الۡمُؤۡمِنُ الۡمُهَیۡمِنُ الۡعَزِیۡزُ الۡجَبَّارُ الۡمُتَكَبِّرُ ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشۡرِكُوۡنَ ﴿۲۳﴾ (59:23)

اِس آیت میں دوسری صِفات کے ساتھ کے ساتھ اَلۡمُؤۡمِنُ: کی صِفت کا ذکر بھی کیا گیا ہے یعنی ''امن وحفاظت کی ضمانت دینے والا۔'' اس کے معنی ''ایمان لانے والا'' نہیں ہوتے۔ خود خدا کی ایک صفت المومن ہے، تو خدا کس پر ایمان لاتا ہے؟ اس کے معنی ہوتے ہیں ''امن وحفاظت کی ضمانت دینے والا''۔ سلامتی اور تکمیل، امن میں ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے بندۂ مومن وہ ہوگا، جس پر تمام انسان اعتماد اور بھروسہ کر سکیں، اور جو تمام دنیا میں امن قائم رکھنے کا ذمہ دار ہے۔ اسی مادہ سے ایمان بھی ہے اور ایمان لانے میں یہ مفہوم سمجھا جاتا ہے کہ

1۔ یقین کرنا، ماننا، تسلیم کرنا، یعنی انکار نہ کرنا۔

2۔ تصدیق کرنا، اس کے سچے ہونے کا اقرار کرنا یعنی تکذیب نہ کرنا۔

قرآن کریم کی رو سے پانچ بنیادی حقیقتیں ہیں، جن پر ایمان لانے سے انسان نظری مومن بن جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ:

وَلٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓئِكَةِ وَالۡكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ (2:177)

مفہوم: ''کشادگی کی راہ اس کی ہے جو اللہ پر، یوم الآخرت پر، ملائکہ پر، کتب پر اور انبیاء پر ایمان لائے۔''

اِس کے ساتھ تنبیہ بھی کی کہ:

وَمَنۡ یَّكۡفُرۡ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا ﴿۱۳۶﴾ (4:136)

مفہوم: ''اللہ، ملائکہ، کُتب، رسول اور یوم الآخرت ان سب کا یا ان میں سے کسی ایک کا انکار کرنے سے انسان کفر یعنی ضلالت میں جا پڑتا ہے۔''

اِس کے ساتھ ہی یہ تصریح بھی کردی کہ ایمان کے معنی ہیں کہ اس کی ہستی پر یقین، اس کی ہر بات پر اعتماد اور ان کی اطاعت کا اقرار کرنا ہے جسے قرآن بیان کرتا ہے۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ (2:137)

مفہوم: ''اگر یہ لوگ اس طرح ایمان لائیں، جس طرح اے جماعت مومنین! تم ایمان لائے ہو، تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ لوگ صحیح ایمان پر ہیں۔''

لہٰذا نظری مومن وہی ہے، جو قرآن کے ایمان لائے اور عملی مومن تب کہلائے گا کہ ایسے ایمان کے مطابق عملِ صالح بھی کرے۔

33۔ البِر:

بِر کا مادہ کے بنیادی معنی وسعت، فراخی اور کشادگی کے ہیں۔ البر غالب آنے والے کو بھی کہتے ہیں۔ البّر خدا کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے۔

اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ﴿۲۸﴾ (52:28)

مفہوم: ''کشادگی اور رحمت عطا کرنے والا۔''

بِر کے معنی ہیں حدود فراموش وسعتوں کا مالک، زندگی میں کشادگی کی راہیں پیدا کرنے والا۔ اسی لیے رحیم کے ساتھ برّ کی صفت بھی آتی ہے۔ مومنین کے لیے بھی ہدایت ہے کہ وہ:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ (5:2)

مفہوم: ''آپس میں مدد کرو نیکی کے کشادگی لانے والے کاموں میں اور تقویٰ پر۔''

چنانچہ راغب نے وضاحت کی ہے کہ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنی ثواب عطا کرنا ہوتے ہیں۔ اور جب بندہ کی طرف منسوب ہو تو اطاعت اور فرمانبرداری کے۔ الابرار کے متعلق قرآن میں ہے کہ وہ:

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿۱۸﴾ (83:18)

مفہوم: ''اور یہ بھی سن رکھو کہ نیکوکاروں کے اعمال علیین (بلند مقام) میں ہیں''۔

34۔ القیوم:

اس کا مادہ ''ق۔ا۔م'' ہے اور بنیادی معنی ہیں کھڑا ہونا، متوازن ہونا، ثابت اور دائم رہنا۔ اسی سے مقام کے معنی ہیں کھڑے ہونے کی جگہ ہے۔ قیوم کے معنی ہوئے اپنی مخلوق کے معاملات کی اس طرح تدبیر کرنے والا کہ ان کی پیدائش اور

روزی بہم پہنچانے کا بندوبست کرنے اور ان کے رہنے کے مقامات کا علم رکھے۔

قرآن پاک میں ہے:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا (4:5)

مفہوم: ''اور بے عقلوں کو ان کا مال جسے خدا نے تم لوگوں کے لئے سبب معیشت بنایا مت دو۔ یعنی ان کو تمہاری بقا کا سبب بنایا ہے۔''

نیز اس کے معنی قائم بالذات بھی ہیں یعنی جو اپنے قیام کے لیے کسی کا محتاج نہ ہو لیکن اس کے بغیر کسی چیز کے قیام کا تصور بھی نہ کیا جا سکے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ (2:255)

مفہوم: ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ زندہ ہے سب کے قیام کا بندوبست والا۔''

مومنین کو اجتماعی طور پر لوگوں کے قیام کا فریضہ ادا کرنے کا سونپا گیا ہے۔

35۔ القریب:

قرآن میں اللہ کے متعلق ہے کہ:

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿16﴾ (50:16)

مفہوم: ''ہم انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔''

رگِ جان سے زیادہ قریب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا قانونِ مکافات ہم پر اس طرح محیط ہے کہ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوا جا سکتا۔ مومنین کی حکومت کی بھی یہی صِفت ہوتی ہے کہ کوئی اُس کے قوانین سے اوجھل نہیں ہوتا۔

36۔ المجیب:

قریب اور مجیب کے الفاظ عام طور پر اردو میں بولے جاتے ہیں۔ ان میں قریب کا مطلب فاصلے میں نزدیک ہونا ہے اور مجیب ہے جواب دینے والا۔ قرآن میں خدا کی صفت بیان ہوئی ہے۔

اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ﴿61﴾ (11:61)

مفہوم: ''یاد رکھو (اللہ) تم سے دور نہیں، قریب ہے اور تمہاری ہر پکار کا جواب دیتا ہے۔''

اس کی وضاحت دوسری جگہ یوں کی ہے۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ (2:186)

مفہوم: ''اور جب میرے بارے میں، میرے بندے پوچھیں تو کہہ دو کہ میں قریب ہوں۔ جواب دیتا ہوں دعا مانگنے والے کو، جب مجھ سے دعا مانگی جائے۔''

ختمِ نبوت کے بعد تو اللہ کسی سے بلاواسطہ کلام نہیں کرتا بلکہ لوگوں کو اُس کے محفوظ آخری کلام القرآن سے ہی جواب تلاش کرنا ہوتا ہے۔ قریب ہونے کی کیفیت اسلامی حکومت کی بھی ہوتی ہے جو ایک آئین کے ذریعہ قانونِ خداوندی کی راہنمائی کرتے ہوئے اُس کا نفاذ کرنے کی ذمہ داری لیتی ہے۔ وہ بھی معاشرہ کے ہر فرد کی ضروریات کو پورا کرنے کی جوابدہ ہوتی ہے اور اُن کی خواہشات کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔

38،37۔ البارئ، المصوّر:

قرآن میں ہے کہ:

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (59:24)

مفہوم: ''اللہ خالق بھی ہے اور الباری بھی ہے اور مصور بھی۔''

ایک نشوونما یافتہ ذات کی بنیادی خصوصیت تخلیق ہے۔ الباری اور المصور بھی درحقیقت عملِ تخلیق کے مراحل سے تعلق رکھتے ہیں۔ تخلیق کے معنی ہیں، مختلف عناصر میں خاص تناسب اور ترتیب پیدا کر کے ایک نئی چیز بنا دینا۔ اس ترتیبِ نو میں حشو دوزوائد کو الگ کیا جاتا ہے۔ یہ باری کی صفت ہے۔ اس کے بعد اسے ایک خاص شکل عطا کرنا صفتِ مصوریت (صورت گری اور نقوش سازی) ہے۔ انہی مراحلِ تخلیق وتسویہ کو الباری اور المصور کی صفات سے موصوم کیا جاتا ہے۔ ضمناً المصور کے معنی نقوش مرتب کرنے والا بھی ہے۔ اس کے معنی صورت عطا کرنے والا بھی ہیں۔ جیسا کہ قرآن کی آیت سے ظاہر کیا گیا ہے کہ

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (59:24)

مفہوم: ''اللہ خالق بھی ہے اور الباری بھی ہے اور مصور بھی۔''

یہ ایک بنیادی صفت ہے۔ ارسطو کے نزدیک کسی شے کا وجود، اس کی صورت کا دوسرا نام ہے۔ یعنی جب کوئی شے ایک صورت اختیار کر لیتی ہے، تو ہم اس وقت کہتے ہیں کہ وہ شے وجود میں آ گئی ہے۔ قرآنِ کریم نے جب خدا کو المصور کہا ہے، تو اس سے یہ مفہوم بھی ہے کہ وہ شے کو خاص صورت عطا کر کے، اسے وجود میں لاتا ہے۔

40،39۔ الحمید، المجید:

حمید کا مادہ ''ح۔م۔د'' ہے، جس کے معنی نہایت حسین، متناسب نادر شاہکار کو دیکھ کر دل میں تحسین وستائش کے جذبات کا پیدا ہونا ہے۔ لہٰذا حمید کے معنی ہوئے ہر قسم کی حمد وستائش کا سزاوار۔

الحمید کے معنی ہر قسم کی صفاتِ محمودہ کا انتہا تک پہنچ جانا ہوتا ہے۔ لہٰذا اسی حقیقت کی بنا پر مومنین کا معاشرہ وہی کہلاتا ہے، جس میں (حدِ بشیریت تک) صفاتِ محمودہ پائی جائیں۔

اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿۷۳﴾ (11:73)

مفہوم: ''وہ حمید اور مجید ہے۔''

مجید کا مادہ ''م۔ج۔د'' ہے، جس کے اصل معنی کثرت کے ہوتے ہیں۔ عربوں میں چونکہ سخاوت بہت بڑا شرف تھا، اس لیے ان کے ہاں المجد بلند ترین شرف کو کہتے تھے۔ اس لئے مجید کے معنی ہوئے ہر قسم کی عظمت و بزرگی کا مالک۔ قرآن شریف میں اللہ کی ان دونوں صفات کا ذکر ہے۔

قرآن نے بھی مومنین کی نشانی میں اُسے تمام سے برتر رہنے میں بتائی ہے۔ علامہ اقبال نے بھی اس کی یوں نشاندہی کی ہے کہ:

مو منے بالائے ہر بالا ترے غیرتِ اُو برنتابد ہمسرے

41۔ الماجدُ:

قرآن میں بھی اِس کی وضاحت ملتی ہے کہ:

وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا (72:3)

مفہوم: ''اور یہ کہ ہمارے پروردگار کا فیضان بہت بڑا ہے۔''

اِس میں جَدُّ بمعنی فیض الٰہی ہی کے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کے معنی عظمت کے ہیں۔ لیکن اس کا مرجع بھی معنی اوّل کی طرف ہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی اضافت اختصاص ملک کے طریق سے ہے اور حظوظ دنیوی جو اللہ تعالیٰ انسان کو بخشتا ہے پر بھی جَدُّ کا لفظ بولا جاتا ہے، جس کے معنی بخت و نصیب کے ہیں۔

42۔ الباسط:

الباسط کا مادہ ''ب۔س۔ط'' ہے، جس کے معنی نشر کرنا، توسیع کرنا، وسعت دینا ہیں۔ چونکہ رزق کی وسعت و کشادخدا کے ہاتھ (قانون) سے وابستہ ہے، اس لیے اسے الباسط بھی کہا جاتا ہے۔

وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۪ (2:245)

مفہوم: ''اور اللہ وہی ہے جو تنگی اور کشادگی دیتا ہے۔''

مومنین کا بھی فریضہ ہے کہ وہ اجتماعی نظام کی تشکیل کے بعد اس نظام کی مدد سے الباسط کی صِفت کے تحت رزق کی تقسیم کی وسعت سے ذمہ داری سے بھی نبرد آزما ہوں۔

43۔ الواسع:

خالق کائنات کی وسعتیں کسی کے حیطہء تصور و قیاس و گمان و وہم میں نہیں سما سکتی ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ (2:115)

مفہوم: ''اللہ لامحدود وسعتوں کا مالک ہے۔ سب کچھ جاننے والا ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ جہت اور مکان کی نسبت، اجسام کے لئے درست قرار پا سکتی ہے۔ وہ ذات ان نسبتوں سے پاک ہے۔ قرآن میں اللہ کی واسع صفت بالعموم علیم کے ساتھ آئی ہے۔ لہٰذا، یہ وسعت درحقیقت اس کے علم و حکمت کی وسعت

ہے۔ چونکہ یہ وسعت لامحدود ہے، اس لئے ہمارا محدود ذہن اس کا تصور نہیں کرسکتا۔ البتہ اتنا تو ہم جانتے ہیں کہ جسم کے مقابلے میں انسان کی ذات کس قدر وسیع ہے۔ ذات کی دنیا تو خیر بہت بلند ہے انسانی فکر کی دنیا بھی بے حد وسیع ہے۔ ہمارے تصورات وخیالات کہاں کہاں پہنچتے ہیں۔ اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا مومنین کی پیہم کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے علم اور صلاحیتوں میں مسلسل وسعت دیتے رہیں۔

44۔ الفتاح:

فتح کے معنی کھولنا، حق و باطل میں تمیز کرنا ہے۔ یہیں سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ جس چیز کو قرآن فتح کہتا ہے اس کا مفہوم کیا ہے؟ قرآنِ کریم کی رو سے فطرت کا اٹل قانون ہے کہ حق غالب رہے گا، اور باطل مغلوب ہوگا۔ جس موڑ میں، حق و باطل کی یہ فطری تمیز کھل کر سامنے آئے گی اسے فتح کہیں گے۔ اس لئے قرآن کریم جہاں مومنین کے لئے فتح کا ذکر کرتا ہے، اس سے مفہوم مجرد فتح نہیں ہوتا بلکہ حق کا غلبہ ہوتا ہے۔ اور چونکہ حق و باطل کی یہ تمیز اللہ کے قانون کے مطابق ہوتی ہے، اس لیے اللہ فتاح ہے۔

رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ (7:89)

مفہوم: ''اے رب ہمارے! ہماری قوم کے درمیان الحق کے مطابق فیصلہ کردے۔''

جب قرآنِ کریم مومنین کے متعلق کہتا ہے کہ انھیں فتح حاصل ہوگئی، تو اس سے اتنا ہی مقصود نہیں ہوتا کہ ان کے دشمنوں کو شکست ہوگئی اور وہ ان پر غالب آگئے۔ اس سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ اس سے وہ موانع دور ہوگئے، جو ان کے آگے بڑھنے کے راستے میں حائل تھے اور اس طرح ان کے سامنے زندگی کی کشاد (خیر) کے مزید دروازے کھل گئے۔ لہٰذا جماعتِ مومنین کی یہ فتح، مزید کشاد کے لئے ایک نئے باب کا افتتاح ہوتا ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے۔ الفتاح کا خدا کی صفت کے طور پر قرآن میں ذکر ہے۔

وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيمُ ﴿٢٦﴾ (34:26)

مفہوم: ''اور وہی ہے غالب کرنے والا، سب کچھ جاننے والا۔''

45۔ الحقّ:

حق اسے کہتے ہیں جو ثابت ہو، اٹل ہو، اَنمٹ ہو، اپنی جگہ پر قائم ہو، حقیقت کے ہر معیار پر پورا اترے، علم و بصیرت کی ہر کسوٹی پر کھرا ثابت ہو، اور اس کے نتائج ہمیشہ تعمیری ہوں، جو حالات کے ہر تعمیری تقاضے کو پورا کرے۔ اس کے برعکس باطل مٹ جانے والا ہے، جو باقی نہ رہ سکے۔ جو محض ظن وتخمین اور قیاس اور گمان میں موجود ہو، فی الحقیقت اس کا وجود کہیں نہ ہو، جو تخریبی نتائج پیدا کرے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (45:22)

مفہوم: ''اللہ نے تو آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔''

خدا نے اپنے لیے بھی الحق کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ الحق ہے ہی خدا کی ذات۔ پھر جو کچھ خدا کی طرف سے آئے وہ حق ہے۔ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ (10:32)

مفہوم: ''سو یہ اللہ ہے رب تمہارا الحق۔ پھر کیا رہ گیا حق کے بعد مگر بھٹکنا۔''

حق صرف اللہ کی ذات ہے۔ باطل کی قوتیں اس وقت دکھائی دیتی ہیں، جب تک حق سامنے نہیں آتا۔ جب حق سامنے آجائے تو باطل فنا ہو جاتا ہے۔

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝۸۱ (17:81)

مفہوم: ''کہہ دو کہ اب حق کا دور آ گیا ہے اور باطل کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔ حق کی موجودگی میں باطل نہیں ٹھہر سکتا۔''

اسی لیے مومنین، بطورِ فرد اور اجتماعی طور پر الحق پر ہی قائم رہتے ہیں اور اپنے معاشرہ میں الباطل کو ملوث نہیں ہونے دیتے۔

46۔ الکریم:

عربوں کے ہاں کریم کا لفظ بڑا وسیع المعنی ہے۔ یوں سمجھئے کہ جس کے متعلق وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس میں انسانیت کی تمام خصائص اعلیٰ ترین شکلوں اور عمدہ صفات میں موجود ہیں، اسے وہ الکریم کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے یعنی ہر قسم کے شرف و مجد کا مالک۔ ہر نوع کی عزت و تکریم کا مستحق ایک نشوونما یافتہ ذات، ان تمام صفاتِ حسنیٰ کا آئینہ دار ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ:

وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ۝۴۰ (27:40) مفہوم: ''بیشک میرا رب غنی اور کریم ہے۔''

خدا ہی کی صفات کو حدِ بشریت میں اپنے اندر منعکس کیے ہوئے رسول کو بھی کریم کا خدا کی طرف سے درجہ عطا ہوا ہے۔

وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ۝۱۷ (44:17) مفہوم: ''ان کے (فرعون) کے پاس آیا رسول عزت والا۔''

اسی روش میں خدا کے بندوں کی بھی یہی آرزو ہوتی ہے کہ وہ بھی صفت کریم کو اپنے اندر سموئے رکھیں، اور خدا سے کریم لوگوں کی جماعت میں داخل ہونے کی سعادت حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہیں۔

بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝۲۷ (36:27)

مفہوم: ''کہ بخشا مجھ کو میرے رب نے، اور کیا مجھ کو عزت والوں میں سے۔''

47 تا 52۔ الاعلیٰ، العظیم، العلی، المتعال، المتین، العزیز:

اللہ کی ذات مکمل ترین ہے، اس لئے اس کا مقام بھی بلند ترین۔ وہ جس عظمت اور بلندی کا مالک ہے اس کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ انسانیت کی میزان میں اعلیٰ، عظیم، متین و عزیز کی خصوصیت رکھنے والا انسان ہی بلند درجہ رکھنے کا حامل تصور کیا جاتا ہے۔

الاعلیٰ کے معنی بالاتر کے ہیں۔ العظیم کے معنی صاحبِ کثیر کے ہیں۔ العلی کے معنی برتر کے ہیں۔ المتعال کے معنی بلند مرتبہ کے ہیں۔ المتین کے معنی قوت والا کے ہیں۔ العزیز کے معنی زبردست غالب کے ہیں۔ اِن صفاتِ خداوندی کا ذکر قرآنِ کریم

سے ملتا ہے۔ الاعلیٰ کی صفت کا ذکر قرآن میں یوں ہے۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۙ (87:1)

مفہوم: ''جدوجہد کر اپنے رب کے نظام ربوبیت کو قائم کرنے کے لیے، جو تمام نظاموں سے اعلیٰ ہے۔''

العظیم اور صفت العلی کا اکھٹے قرآن کریم میں ذکر ملتا ہے کہ:

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝۲۵۵ (2:255) مفہوم: ''وہ وہی ہے سب سے برتر عظمت والا۔''

اسی عنوان کے تحت صفت المتعال کا ذکر قرآنِ کریم میں اللہ کی صفت میں ہے:

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝۹ (13:9)

مفہوم: ''جاننے والا پوشیدہ اور ظاہر کا سب سے بڑا اور برتر۔''

اس عنوان کی صفت المتین کا ذکر قرآنِ کریم سے اللہ کی صفت کے طور پر ملتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ۝۵۸ (51:58)

مفہوم: ''اللہ جو ہے وہی ہے روزی دینے والا زور آور مضبوط۔''

اسی کے ساتھ صفت العزیز کا بھی خدا کی صفت کے طور پر قرآنِ کریم میں ذکر ہے:

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱۲۹ (2:129) مفہوم: ''بیشک تو ہی ہے زبردست بڑی حکمت والا۔''

لہٰذا اللہ کی صفت کبریائی کا اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا۔ اس کی وضاحت خود قرآن سے ملتی ہے۔

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝۴۳ (17:43)

مفہوم: ''ان تمام عیبوں سے پاک اور برتر، جو اس کے متعلق جہالت کی بناء پر کی جاتی ہیں۔''

عزت کے معنی بھی قوت کے ہیں۔ لیکن ایسی قوت جس کے ساتھ غلبہ بھی شامل ہو۔ اسی لیے عزیز کے معنی صاحبِ غلبہ ہوں گے۔ متانت میں بھی قوت کا مفہوم عیاں ہے۔ لیکن یہ ایسی قوت ہے، جس میں کہیں ڈھیل نہ ہو، کسر نہ ہو۔ اس لیے متین ایسا صاحبِ قوت ہوگا، جس کی تدابیر مضبوط اور محکم ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب خدائے بلند و برتر اس درجہ عالی مرتبت ہے، تو دنیا میں اس کی حکومت قائم کرنے والے بندے بھی کس بلندی پر ہوں گے۔ ایسی بلندی کہ کوئی دوسری قوم ان کی گرد تک نہ پہنچ سکے۔ انہیں کے متعلق کہا گیا ہے۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱۳۹ (3:139)

مفہوم: ''مت ہمت ہارو، بالکل غمگین نہ ہو۔ تم ہی سب سے برتر و اعلیٰ ہو۔ اگر تم سچے مومن ہو۔''

جس طرح خدا تمام موجودات میں علم، مرتبت اور رفعتِ شان کے لحاظ سے وحدہٗ لاشریک ہے۔ اسی طرح اس کے بندوں کی یہ جماعت تمام نوعِ انسان میں اپنا شریک و حریف نہیں رکھتی۔ لیکن ان کی یہ رفعت اور بلندی نہ سرکشی و تمرد کی پیدا

کردہ ہوگی، نہ اسے پیدا کرنے کی موجب ہوگی۔ بڑائی وہی بڑائی ہے جو قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے سے حاصل ہو۔ قیام وہی قیام ہے جس کے ساتھ سجدہ بھی شامل ہو۔ لہٰذا ہر قسم کی بڑائی اور عظمت اللہ کے لئے، اللہ کے دین کے لیے اور اس ملت کے لیے ہے، جو دنیا میں اس کے دین کے تمکّن کا باعث ہو۔ جب قرآنِ کریم نے یہ کہا کہ محکم اور پائیدار عزت و تکریم، جماعتِ مومنین کے لیے ہے اور عزت بھی ایسی کہ کوئی دوسری قوم اِن کی ہمسری نہیں کرسکتی تو اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ ایسی خصوصیت نہیں رکھتے اپنے آپ کو مومنین نہیں کہہ سکتے۔

53۔ الملک:

الملک: مادہ "م۔ل۔ک" ہے۔ معنی ہیں قوت رکھنا، کسی چیز پر قادر ہو جانا، اختیار و ارادہ، اتھارٹی اور محکم بنیاد۔ نیز وہ سہارا جس پر کوئی چیز قائم ہو۔ اس لئے پانی اور غذا، نیز دیگر اسباب و ذرائع کو بھی ملک کہا جاتا ہے۔ اس مادہ سے ملکوت ہے یعنی عزت و اقتدار، حکومت و سلطنت؛ نیز ملک عظیم کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ لیکن یہ اللہ کی مملکت کے لئے مخصوص ہے۔ اس لئے کہ کائنات میں تمام اختیار و اقتدار اسی کا ہے، وہی اس کی بنیاد اور سہارا ہے۔

ملک یا ملکوت، حکومت اور اقتدار کے معنوں میں آتا ہے۔ اسے عام الفاظ میں بادشاہ کہتے ہیں۔ ساری کائنات پر حکومت اور بادشاہت اللہ کی ہے، اس لیے خدا نے اپنے آپ کو مالک بھی آیت (59:23) میں کہا ہے، جس میں صفاتِ خداوندی کا ذکر کیا گیا ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۲۳﴾ (59:23)

مفہوم: ''اللہ وہی ہے، جس کے سوا کائنات میں کسی اور کا اقتدار اور اختیار نہیں، ساری کائنات اسی کی مملکت ہے۔ اس کے اقتدار اور علم کی وسعتیں لا انتہا ہیں۔ اس کی ذات مکمل ترین اور ہر نقص سے پاک ہے، اور وہ ہر ایک کو ذات کی تکمیل کا سامان عطا کرتا ہے۔ وہ کائنات کو تخریبی قوتوں کے اثرات سے محفوظ رکھتا ہے، اور کوئی شے اس کی نگہبانی کے دائرے سے باہر نہیں۔ اسے ہر قسم کا غلبہ اور تسلط حاصل ہے، جس کی وجہ سے، وہ اپنے پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کی قوت رکھتا ہے۔ اس نے ہر شے کو اس طرح اپنے قانون کی گرفت میں لیا ہوا ہے کہ وہ اپنے مقام سے ذرا اِدھر اُدھر نہیں ہٹ سکتی۔ اس کا کوئی ہمسر نہیں، عظمت و کبریائی سب اسی کے لئے ہے۔ وہ اس سے بہت دور ہے کہ اس کے ساتھ کسی اور کی قوت اور اقتدار کو بھی شریک سمجھا جائے۔''

یہ قرآن اس خدا کی طرف سے ہے جو:

1۔ اَلْمَلِكُ: یہ بڑا ہی جامع لفظ ہے۔ اس کے معنی مالک بھی ہے، قادر بھی ہے، قوت والا بھی ہے، بادشاہ بھی ہے، صاحبِ اقتدار بھی ہے۔

2۔ اَلْقُدُّوْسُ: معنی ہیں، جس کی وسعتیں لا انتہا ہوں۔ اوپر اَلْمَلِكُ تھا، اور اس کے فوراً بعد القدوس ہے یعنی ساری

سلطنتوں ومملکتوں میں، جتنا اقتدار ہوتا ہے، وہ اس القدوس کی حدود کے اندر آجاتا ہے، اسی لئے اَلْمَلِکُ کے بعد القدوس آیا ہے کہ خدا کی مملکتیں حدود فراموش ہیں۔ یہ ہے القدوس کا مفہوم۔ یہ مملکتیں، یہ اقتدار، یہ لاانتہا وسعتیں کس مقصد کے لئے ہیں؟

3۔ اَلسَّلٰمُ: ''خود اپنی ذات کے اندر پوری تکمیل کی انتہا تک پہنچا ہوا''۔ خدا کی ذات تو از خود تکمیل کو پہنچی ہوئی ہے، اس لئے معنی ہو جائیں گے کہ وہ جو انسانوں کی ذات کی تکمیل کرنے والا ہے۔ مرغ مسلم اس کو کہتے ہیں، جس کا ایک اعضاء بھی کم نہ ہو۔ تکمیل کے لئے پہلی شرط امن اور سلامتی کی ہے۔ جب آپ کو خطرات کا دھڑکا ہو، تو آپ کی تکمیل کیا ہوگی؟ آپ کو تو ہر وقت اپنی فکر لگی ہوگی کہ کسی طرح بچ جائیں۔ ذات کی تکمیل تو پورے اطمینان اور امن میں ہوتی ہے۔

4۔ اَلْمُؤْمِنُ: ''امن وحفاظت کی ضمانت دینے والا''۔ اس کے معنی ''ایمان لانے والا'' نہیں ہوتے۔ خود خدا کی ایک صفت المومن ہے، تو خدا کس پر ایمان لاتا ہے؟ اس کے معنی ہوتے ہیں "امن وحفاظت کی ضمانت دینے والا"۔ سلامتی اور تکمیل، امن میں ہوتی ہے۔

5۔ اَلْمُهَيْمِنُ: ''سب کو اپنے احاطہ حفاظت میں لے لینے والا''۔ قرآن کریم کو خدا نے اَلْمُهَيْمِنُ کہا ہے یعنی جتنی صداقتیں سابقہ انبیائے کرام کو ملی تھیں، وہ سب کی سب اس کے اندر محفوظ ہیں۔

6۔ اَلْعَزِيْزُ: ''صاحبِ قوت وغلبہ واقتدار''۔ اس کے معنی عزت بھی کئے جاتے ہیں۔ جب انسان صاحب غلبہ ہو، تو عزت تو خود بخود آجاتی ہے۔

7۔ اَلْجَبَّارُ: ''قوت کے زور سے، انسانیت کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے والا"۔ ہڈی ٹوٹ جائے، تو آج پلستر کر دیا جاتا ہے، لیکن نزول قرآن کے دور میں، اور کچھ پہلے تک، ٹوٹی ہوئی ہڈی کو، قوت کے ساتھ، اپنے مقام پر لا کر آس پاس لکڑیاں لگا کر باندھ دیا جاتا تھا، تاکہ ٹوٹی ہوئی ہڈی، اپنے مقام سے نہ ہلے اور ہڈی جڑ جائے۔ جو لکڑیاں ہڈی کے آس پاس لگائی جاتی تھیں ان کو عرب جبائر کہتے تھے، اور ایسا کرنے والے کو جبار کہتے تھے۔ تو جبار کے معنی ہو جائیں گے کہ" وہ جو اصلاح کرنے والا ہو یا الحاق کرنے والا ہو"۔ خدا کا سارا اقتدار انسانیت کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو قوت کے زور پر، صحیح کرنے کے لئے ہے۔ اگر انسان مومن نہ ہو، تو اس کی قوت، اس کا جبر ہڈیاں جوڑنے کے لئے نہیں، توڑنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

8۔ اَلْمُتَكَبِّرُ: ''کبریائی کا مالک" یعنی (sovereignty supreme) جس کے اوپر کوئی اتھارٹی نہ ہو، جو کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہو۔ تکبر کے معنی غرور اور فخر نہیں ہے۔ (sovereignty) تو ایک مملکت کے اندر ہوتی۔ خدا کی (sovereignty) پوری کائنات کے اندر ہے، کیونکہ وہ انتہائی قوت واقتدار کا مالک ہے۔

9۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ: کہا کہ یہ جو ہم نے صفات بیان کی ہیں، ان میں ال لگا کر اضافہ کرنے سے وہ مطلق ہو جاتی ہیں اور ایسی صِفات میں اگر کسی اور کو تم نے اگر شریک کر لیا کہ وہ بھی صاحبِ اقتدار ہے، اس کو بھی اتھارٹی حاصل ہے، تو یہ شرک ہو گیا۔ خدا اس سے بہت دور ہے کہ اس کی صفات میں کسی اور کو بھی شریک سمجھا جائے۔

54، 55۔ الشاکر، الشکور:

خدا کی طرف سے شکر کے بنیادی معنی ہیں، اعمال کے بھرپور نتائج۔ لہٰذا الشاکر اور الشکور کے معنی ہیں انسان کے تعمیری اعمال کا بھرپور نتیجہ دینے والا۔ انہی معنوں کو اللہ کی صفت کے طور پر قرآن نے بیان کیا ہے۔ خدا کی طرف سے پورا پورا بدلہ دینا، اور انسان کی طرف سے اطاعت اور احسان مندی کا اظہار کرنا ہے۔ اَلشِّکْرَۃُ اس اونٹنی کو کہتے ہیں، جس کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے ہوں۔

فَاِنَّ اللّٰہَ شَاکِرٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۵۸﴾ (2:158)

مفہوم: ''بیشک اللہ شاکر و علیم ہے۔''

جماعت مومنین سے کہا گیا کہ:

وَّاشْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ (16:114)

مفہوم: ''تم اللہ کی نعمتوں کو بے نقاب رکھو۔ اگر تم صرف اللہ کے لئے قانون کی اطاعت کرتے ہو۔''

اِن تصریحات سے واضح ہوا کہ قرآن کریم میں شکر کی اصطلاح مندرجہ ذیل مفہوم میں استعمال ہوئی ہے کہ:

1۔ مساعی کے مشکور ہونے سے مراد یہ ہے کہ کوشش کے بھرپور نتائج پیدا ہو جائیں۔ کوششیں پوری طرح ثمر بار اور نتیجہ خیز ہو جائیں۔

2۔ اِنسان کی طرف سے شکر کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو بے نقاب کیا جائے، یعنی وہ اپنی مضمر صلاحیتوں کو پوری پوری نشوونما کرے، کائنات میں پھیلے ہوئے، سامان نشوونما کو نوع انسانی کی پرورش کے لئے کھلا رکھے، اور ان پر پردے نہ ڈالے۔

3۔ یہ سب اس طرح ہو سکتا ہے کہ انسان اللہ کے قوانین کی پوری پوری اطاعت کرے، ان کے مطابق زندگی بسر کرے۔ یہ انسان کی طرف سے شکر ہوگا، جس سے اس کی ذات کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے

4۔ اللہ کی طرف سے شکر کے معنی یہ ہیں کہ وہ انسانی اعمال کے بھرپور نتائج پیدا کر دے۔ یہ اللہ کے قانون کی خصوصیت ہے کہ جو اس کی ہدایت کے مطابق چلتا ہے، تو قانون میں پوشیدہ فطری نتیجہ، انسان کی کوششوں کے نتیجے میں سامنے آ جاتا ہے۔ نتیجے کا سامنے آنا انسان کے لئے اللہ کی طرف سے شکر ہے۔

56 تا 59: الحفیظ، الرقیب، المھیمن، المقیت:

قرآنِ کریم نے ان صفات کی درج ذیل آیات سے وضاحت کر دی ہے کہ ان تمام صفات کا مفہوم نگہبانی کا تصور لئے ہوئے ہے۔

وَرَبُّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ ﴿۲۱﴾ (34:21) مفہوم: ''تمہارا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔''

دوسرے مقام پہ ہے کہ:

فَاللّٰہُ خَیۡرٌ حٰفِظًا ۪ (12:64) مفہوم: ''اللہ بہترین حفاظت کرنے والا ہے۔''

وَّکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ رَّقِیۡبًا ۝۵ (33:52) مفہوم: ''اور ہے اللہ ہر چیز پر نگہبان۔''

الرقیبُ، اَلرَّقَبَۃُ: اصل میں گردن کو کہتے ہیں پھر رَقَبَۃ کا لفظ بول کر مجازاً انسان مراد لیا جاتا ہے اور کسی کی حفاظت کرنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:

لَا یَرۡقُبُوۡنَ فِیۡ مُؤۡمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّۃً ؕ (9:10)

مفہوم: ''کسی مسلمان کے بارے میں نہ تو قرابت کا پاس ملحوظ رکھتے ہیں اور نہ ہی عہد و پیمان کا۔''

اسی سے نگران کو رَقِیۡبٌ کہا جاتا ہے یا تو اس لئے کہ وہ اس شخص کی گردن پر نظر رکھتا ہے جس کی نگرانی منظور ہوتی ہے اور یا وہ نگرانی کے لئے بار بار اپنی گردن اٹھا کر دیکھتا ہے قرآن پاک میں ہے:

وَارۡتَقِبُوۡۤا اِنِّیۡ مَعَکُمۡ رَقِیۡبٌ (11:93) مفہوم: ''تم بھی منتظر رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔''

اِلَّا لَدَیۡہِ رَقِیۡبٌ عَتِیۡدٌ ۝۱۸ (50:18) مفہوم: ''مگر ایک چوکیدار (اس کے لکھنے کو) تیار رہتا ہے۔''

اَلۡمَرۡقَبُ: بلند جگہ جہاں رقیب (نگران) بیٹھ کر چوکسی کرتا ہے اُلھیمن بھی نگران کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

اَلۡمَلِکُ الۡقُدُّوۡسُ السَّلٰمُ الۡمُؤۡمِنُ الۡمُہَیۡمِنُ (59:23)

مفہوم: ''بادشاہ، نہایت پاک، سلامتی دینے والا، امان بخشنے والا، حفاظت کرنے والا۔''

دوسرے مقام پہ ہے کہ:

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ مِنَ الۡکِتٰبِ وَمُہَیۡمِنًا عَلَیۡہِ (5:48)

مفہوم: ''اور ہم نے تیری طرف کتاب حق کے ساتھ اتاری، اس کی تصدیق کرتی ہوئی، جو اس سے پہلے کتاب میں سے ہے، اور ان پہ نگہبان۔''

المُقیتُ۔ اَلۡمَقۡتُ کے معنی محافظ اور کسی شخص کو فعل قبیح کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھ کر اس سے بہت بغض رکھنے کے ہیں۔ قرآنِ پاک میں ہے۔

وَّکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ مُّقِیۡتًا ۝۸۵ (4:85) مفہوم: ''اور اللہ ہے ہر چیز پر قدرت رکھنے والا محافظ۔''

دوسرے معانی میں ہے کہ:

اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً وَّمَقۡتًا ؕ وَسَآءَ سَبِیۡلًا ۝۲۲ (4:22)

مفہوم: ''یہ نہایت بے حیائی اور (خدا کی) ناخوشی کی بات تھی اور بہت برا دستور تھا۔''

ظاہر ہے کہ جب یہی صفات بشری حد تک انسانی ذات میں منعکس ہو جائیں، تو خود اس کی اپنی کیفیت کیا ہو جائے گی اور اس کے نتائج کس قدر نفع بخش ہوں گے؟ جو معاشرہ ایسے افراد پر مشتمل ہوگا، اور جو نظام ان ہاتھوں سے متشکل ہوگا، اس

میں تمام افرادِ انسانیت کے لئے زندگی کا سامان فراوانی سے موجود ہوگا۔ نہ صرف طبیعی زندگی کا بلکہ انسانی زندگی کا بھی۔ یعنی اس میں تمام افراد کی ذات کی نشوونما کا سامان موجود ہوگا اور اس کی حفاظت بھی ایسی ہوگی، جس کے نتیجے میں پوری نوعِ انسان امن وسکون اور اطمینان کی حالت میں رہے گی۔

60۔ الوہاب:

موہبت ایسے عطیہ کو کہتے ہیں جو نہ کسی غرض کے لئے دیا جائے، نہ معاوضہ کے طور پر۔ کائنات میں انسانی نشوونما کے لئے، جس قدر سامان موجود ہے، وہ سب خدا کی طرف سے اسی قسم کا عطیہ ہے۔ اس لیے خدا کی صفت الوہاب ہے۔

اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (3:8) مفہوم: ''بے شک تو (اللہ) وہاب ہے۔''

انسانی نشوونما میں، سامانِ زیست کے علاوہ، وحی کی راہ نمائی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ بھی خدا کی طرف سے موہب ملتی ہے۔ اس میں دینے والے (خدا) کی طرف سے کسی معاوضہ کا سوال ہوتا ہے، نہ لینے والے (نبی) کے کسی کسب وہنر کا دخل۔ انسانی دنیا میں جن افراد کی ذات، اس صفتِ خداوندی کی آئینہ دار ہوگی، ان کی کیفیت بھی یہ ہوگی کہ وہ باقی افرادِ انسانیہ کو سامانِ زیست بلامزد ومعاوضہ عطا کریں گے۔ اس کا نام نظامِ ربوبیت ہے، جو جماعت مومنین کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے۔

61۔ الغنی:

قرآن نے دنیا کو جب خدائے حقیقی سے روشناس کرایا تو اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ قوانینِ خداوندی کا اتباع انسانوں کے اپنے فائدے کے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اس میں کوئی ''ذاتی فائدہ'' مضمر نہیں۔ اس لئے اسے انسانوں کی عبودیت اور ان کے ''نذرانے'' کی کوئی حاجت نہیں، وہ اِن چیزوں سے بے نیاز ہے، مستغنی ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (2:267) مفہوم: ''بے شک اللہ غنی ہے سب خوبیوں والا۔''

یہ سب کچھ ہمارے فائدے کے لئے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذات کی بنیادی خصوصیات حریت اور استغنا ہے۔ ایک نشوونما یافتہ ذات، خود مکتفی اور دوسروں کے سہارے سے بے نیاز ہوتی ہے۔ لہٰذا خدا کی ذات کسی کی محتاج کس طرح ہوسکتی ہے؟ یہی کیفیت ان لوگوں کی ہوگی جن کی ذات صفاتِ خداوندی کی آئینہ دار ہوگی۔ وہ بھی دنیا میں کسی کی محتاج نہیں ہوں گے اور جو معاشرہ ان لوگوں کے ہاتھوں متشکل ہوگا وہ بھی دوسروں کے سہارے سے مستغنی ہوگا۔

62۔ التواب:

امام راغب نے کہا ہے کہ اَلتَّوْبُ: (ن) کے معنی گناہ کے باحسن وجوہ ترک کرنے کے ہیں اور یہ معذرت کی سب سے بہتر صورت ہے کیونکہ اعتذار کی تین ہی صورتیں ہیں۔

(i) پہلی صورت یہ ہے کہ عذر کنندہ اپنے جرم کا سرے سے انکار کر دے اور کہہ دے لَمْ اَفْعَلْهُ کہ میں نے کیا ہی نہیں۔

(ii) دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے لیے وجہ جواز تلاش کرے اور بہانے تراشنے لگ جائے۔

(iii) تیسری صورت یہ ہے کہ اعتراف جرم کے ساتھ آئندہ نہ کرنے کا یقین بھی دلائے۔

الغرض اعتذار کی یہ تین ہی صورتیں ہیں اور کوئی چوتھی صورت نہیں ہے اور اس آخری صورت کو توبہ کہا جاتا ہے مگر شرعاً اسے توبہ جب کہیں گے کہ

ایک چوتھی صورت میں گناہ کو گناہ سمجھ کر چھوڑ دے اور اپنی کوتاہی پر نادم ہو اور دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عزم کرے۔ اگر ان گناہوں کی تلافی ممکن ہو تو حتی الامکان تلافی کی کوشش کرے۔

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا ﴿٧١﴾ (25:71)

مفہوم: ''اِس کے معنی یہ ہیں کہ گناہ ترک کر کے عمل صالح کا نام ہی مکمل توبہ ہے۔''

پس توبہ کی یہ چار شرطیں ہیں جن کے پائے جانے سے توبہ مکمل ہوتی ہے۔

اِس کے بنیادی معنی ہیں واپس آجانا۔ التواب کی مثال یوں ہے کہ آپ کسی جگہ جا رہے ہیں، راستے میں ایک دوراہے سے آپ غلط سمت کی طرف مڑ جاتے ہیں۔ کچھ دور جا کر آپ کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ آپ غلط راستے پر پڑ گئے ہیں یہاں سے صحیح راستے پر جانے کے لئے ضروری ہے کہ آپ پھر اس مقام پر واپس آجائیں، جہاں سے آپ کا قدم غلط سمت کی طرف اٹھا تھا۔ اس طرح واپسی کو توبہ کہتے ہیں۔ خدا کے قانون مکافات کی رو سے عمل اور اس کے نتیجہ میں نمودار ہونے میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ اگر اس دوران میں انسان اس غلط روش سے باز آ کر صحیح روش اختیار کر لے اور پھر ایسے تعمیری کام کرے، جن سے سابقہ تخریب کے مضر اثرات سے حفاظت مل جائے، تو وہ شخص تباہی اور بربادی سے بچ جاتا ہے اور اپنے مقصد کے حصول کا امیدوار بن جاتا ہے۔ اس صفتِ خداوندی کا نام توابیّت ہے۔

إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿٣٧﴾ (2:37)

مفہوم: ''بیشک وہ توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔''

یہ ذہنی نہیں، ایک عملی قدم ہے، جس سے غلط کام کو صحیح کیا جاتا ہے، تاکہ اس کے مضر اثرات کی تلافی کی جائے۔ تاب عنہ اور تاب منہ کے معنی ہیں، اس نے اپنی غلطی کا احساس کیا، اور احساس کے بعد غلط روش سے اجتناب کیا، اور پھر صحیح روش اختیار کی۔ غلطی کا احساس، غلطی سے اجتناب اور صحیح روش اختیار کرنا، یہ تینوں مراحل توبہ میں شامل ہیں۔ ایسا کرنے والے کو تائب کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اس وقت ممکن ہے، جب انسان کے پاس اعمال صالحہ کرنے کی مہلت باقی ہو۔ قرآن میں ہے کہ:

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴿٢٢٢﴾ (2:222)

مفہوم: ''اللہ انہی کو پسند کرتا ہے، جو غلط راستہ کو چھوڑ کر، صحیح راستہ اختیار کریں، اور آئندہ غلط امور سے دور رہیں۔''

(جاری ہے)

Surah *Muhammad* (محمّد) – Durus-al-Qur'an: Chapter 6

By G. A. Parwez (Episode No.1)
(Translated by: Mansoor Alam)

My dear friends, today is February 19, 1982 and today's lecture starts with verse (47:22) of Surah Muhammad (محمّد).

The social condition of Medina

If you remember we discussed the two-pronged attack that the Prophet's (PBUH) faced in Medina. One was from the Quraysh and their supporting tribal base. This was from clear cut open enemies of the Prophet (PBUH). They had no trace of hypocrisy in them. This was their tribal nature and character. Even after the Prophet (PBUH) migrated to Medina their constant attack against the Prophet (PBUH) was completely overt and fierce.

However, the majority population of Medina was Jewish who, like any capitalists, were at the forefront of hypocrisy. The Bedouin tribes of Medina living alongside the Jews were also mostly hypocrites. And, so, the challenge in Medina that the Prophet (PBUH) faced from these hypocrites were covert and sinister. In his life in Medina this is what the Prophet (PBUH) faced – the heart-wrenching machinations of the hypocrites from the inside, and the continuous fierce attack by heavily armed Quraysh from outside. This was an extremely difficult situation that the Prophet (PBUH) and his small band of companions faced in Medina.

These were the **منافقین** (Hypocrites) that the Quran mentions whenever it talks about **منافقین** (Hypocrites). Those who had accepted Islam with full sincerity of their hearts which the Quran refers to as the companions of the Prophet (PBUH) – there was no question of them being **منافق** (Hypocrite); there is no question of deviating from this Iman because Allah Himself gives the evidence of their Iman. Therefore, those who quote history written two hundred years after the Prophet (PBUH) and point out that many companions became **مرتد** (*Murtad*) – deviated after Iman – is not true according to the Quran.

The Quran describes history to reveal universal principle

The Quran brings out examples of events from history to highlight the universal principles hidden behind those events. If the events are related to humans then the Quran brings out human mindset and psychology through those events. The events happen in specific places and times but the mindset behind them are similar. The way

past history is taught to our children in school by chronicling events and persons is meaningless and has nothing to do with present or future. The Quran does not do this. Whenever the Quran mentions past history it always brings out the underlying conclusion based on its specific universal principle revealing human mindset for the progeny for learning lessons. This is the reason the Quran does not describe history like historians do. The Quran describes only that part of history that is relevant to its underlying principles and goals.

This is the reason the Quran does not document details pertaining to the events that are totally unnecessary to its main thrust of revealing the human mindset behinds events. But we turned this upside down and started compiling history by providing detailed narrations going completely against the principle of the historiography of the Quran – going so far as to naming names of **منافقین** (Hypocrites) – after two hundred years after the Prophet (PBUH) and that too based solely on oral narrations.

With this brief backdrop let us take the starting verse (47:22) of today's lecture: فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِن تَوَلَّيْتُمْ أَن تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ (47:22) – Tell them, O Messenger! If you now back out from your promise, you will cause disorder in society by joining hands with troublemakers; and you will break off your ties with your kith and kin (the majority of whom are with the Muslims).

The word لعنت (La'anat) is translated as "curse" in traditional translations. We have discussed this many times before, but it needs to be emphasized again and again because it creates such a wrong concept of Allah, as if He has emotions like humans. My dear friends, it is unbecoming of Allah to curse like humans, such as when a man cannot stand up to another man then he curses him from a distance?

Meaning of لعنت (La'anat) and its psychological effect on hypocrites

The mean of لعنت (La'anat) according to its root meaning is "to be deprived of." So, the meaning of لعنت (La'anat) in the above verse regarding the hypocrites is: If you (hypocrites) had accepted the truth with full sincerity and worked with the Prophet's team then you would have received the benefits of life. Since you didn't, you were deprived of it. Since psychology affects the human mind and heart, the Quran says: أُولَـٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّـهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ (47:22) – How sad this reality is, that on account of their attitude, they were deprived of the blessings which they would have otherwise received by taking part in the Jihad. Their senses became so blurred that they could neither listen nor see. This is what happens in hypocrisy. Quran explains this in more details: لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَـٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (7:179) – they have been given the faculties of thinking, seeing and hearing but they do not utilize them (to grasp the truth). They are just like animals – and indeed worse than them.

My dear friends, the ability of think and ponder are at the core of being human. If these abilities are not used in the service of truth, i.e., are not for the welfare of humanity then humans descend to the level of animals – in fact, worse than animals.

They make the world hell due to their hypocrisy because they are destined for hell.
The ability to think and ponder are Allah-given ability, so the Quran appeals to it at every step: أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (47:24) – It is a matter of great surprise that these people do not seriously apply their minds to what the Quran says. Why have their hearts become so blocked that nothing reasonable gets into them? This is because their hypocrisy has incapacitated their ability to understand.

Locks on human hearts

The Quran mentions an extremely important point in the above verse – أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (47:24). You can pick up any translation and you will the following translation: "Are their hearts are locked up?" Yes, their hearts are locked. But how? The verse ends with "هَا" which means that the lock does not come from outside but it comes from their own hearts. Allah-u Akbar! Only a western psychology can appreciate this my friends. Imagine, my friends, the Quran said this 1400 years!

The Quran 1400 years revealed secrets of human psychology

My dear friends, these are the things that point out that these words are from a superior power beyond humans. No human being could have even imagined this fact of psychology fourteen hundred years ago, let alone come up with this fact of psychological mystery that the human behavior itself puts lock on the heart – أَقْفَالُهَا (47:24). The question is: which human behavior causes this lock on the heart? The Quran gives the answer: it is hypocrisy which does it. The Quran further says: إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ وَأَمْلَىٰ لَهُمْ (47:25) – It is a fact that people who turn their backs even after clearly understanding the Quranic guidance, do so because their desires encourage them to embellish their selfish gains and entertain false hopes. Thus they give preference to their individual short term selfish interests, over Quranic guidance (which promotes benefit for all humankind).

Our Sharia's fatwa regarding مرتد (*Murtad*) – deviators after Iman

Do you know my friends that the biggest crime in our religion is to ponder in the Quran? Anyone who does this is declared **مرتد** (*Murtad*) – deviated from Iman. And our Shaia's fatwa is to kill such a person who dares to think in the Quran on his own. And then the fatwa is so broad and general that anyone can kill that person. And, further, can you imagine my friends that the fatwa also says that the killer is guaranteed heaven?! No prosecution, no evidence, no court, and no jury – nothing is required. Muslims kings in cahoots with religious priesthood have used this fatwa to kill anyone whom they declared **مرتد** (*Murtad*).

Interpretation by repetition not by intellect

Our Quran interpretations are based on repetition. Our religious scholars (at the behest of kings) proclaimed that the best way to learn the Quran and Islam is by following our past scholars. This is referred to as the principle of Taqlid (or blind following) in Sharia terminology. Those who disagreed with Taqlid and used intellect and did high quality ad excellent interpretation of the Quran were

considered a threat to both the religious and temporal status quos. So, they were labelled "Mu'tazila" or "dropouts" (from status quo) because they wanted to use intellect to understand the Quran. Since kings exercised absolute power of dictatorship they killed an exterminated these people – even more so than what Genghis and Hulegu could do. And since both the religious priesthood and kings were afraid that their interpretation based on intellect would create a revolution that could overthrow both of them from power they burned all their books and writings so no one would be influenced by their thoughts. How do we know then that they did high quality ad excellent interpretation of the Quran since there books are no longer available? Well, whenever our traditional interpreters condemn them and ridicule them by quoting from their writings – then we know that what they were saying was shining gem.

So, what was the Quran's demand that you must ponder in the Quran; that you must use intellect to understand the Quran was declared innovation in Islam by religious scholars and hence deviation from status and quo and hence leading to hell. This is clearly against the Quran which declares that those who do not use intellect to understand it, they are the ones who are destined for hell.

When thinking is declared crime for a nation then hell surrounds it from all sides

So, pondering in the Quran became a crime as declared by the establishment Sharia. But the Quran keeps emphasizing to use intellect: أَفَلَا تَعْقِلُونَ (2:76) – why don't you use your intellect? أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ (6:50) – why don't you ponder? وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّـهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَـٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ (2:154) – During the struggle for the establishment of the Divine System one should be prepared even to face death. If someone dies in this struggle, he should not be considered dead for he has attained eternal life even though it cannot be perceived through the senses.

These are all the instructions of the Quran. But what we have done is to revert them. Where the Quran is saying to think and to ponder; to analyze and to synthesize; to plan and to execute; and to implement the Quran's guidelines and instructions in this world – we say it is forbidden to think. And where the Quran forbids us to make effort to think – that is about the hereafter because with our present consciousness we cannot understand about the hereafter – we spend all the time conjecturing and presenting graphic descriptions of the hereafter and what will happen there as if we have been there and seen those things. What was our Allah-given syllabus we ignored and we created our own syllabus which Allah forbids us to do? The result is in front of us: إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ وَأَمْلَىٰ لَهُمْ (47:25) – It is a fact that people who turn their backs even after clearly understanding the Quranic guidance, do so because their desires encourage them to embellish their selfish gains and entertain false hopes. Thus they give preference to their individual short term selfish interests, over Quranic guidance. And there is no end to their greed.

They build big grand schemes to get rich. There is a limit to how much one can eat. But there is no limit to human greed. It stretches until the grave: حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:2) – If you confine your demands to fulfilling only your own needs, then what is acquired would be limited. However when the motive is to excel over each other, then there can be no limit. In that case the more you acquire the greedier you become, till such time that you reach your grave. Their psyche becomes totally disoriented and distorted: ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لِلَّذِينَ كَرِهُوا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْأَمْرِ ۖ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِسْرَارَهُمْ (47:26) – Then they secretly join hands with those who abhor Divine Laws and tell them, "We shall obey you in certain matters." Tell them, O Messenger, that Allah is fully aware of their secret intentions and plans. Their whole life is spent in hypocrisy but they pretend to be Muslims. They claim to believe in the Quran and their entire life is against the Quran. فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ (47:27) – At present they are contented by conspiring in this way but what will be their state when death faces them; and the adverse results of their erroneous deeds overwhelm and crush them?

The Quran describes life after death in metaphors

My dear friends, we cannot understand the mystery of death and the hereafter. But a picture emerges from the way the Quran has explained this mystery with examples. When we will proceed further in these lectures then the Quran will go into more details by giving examples of the hereafter; and I will explain at that time the meaning and goals behind those examples.

No matter what these hypocrites do, one thing is sure that they are going to die one day. And no one has come back after death – nor one will ever be coming back – to tell what it is like after death. This is something that will remain secret forever. No matter how curious humans are to know the truth about what happens after death they cannot find out. This is beyond their present conscious mind to know. Just as a child cannot understand deep metaphysical and philosophical realities because it is beyond her capabilities, similarly a mature human is infant in terms of understanding the realities of life after death. Therefore, the Quran has described these realities in metaphors and similes.

Metaphorical description of life after death

Please do not be misled by the news that is coming from some top magazines such TIMES about what they call "Near Death Experience." This they claim is based on stories of people who were pronounced clinically dead and came back to life to narrate their experiences while they were pronounced dead by doctors. Some people have even written books about it. Since people are generally curious about what happens in the afterlife, these books have gone on to be on top of the best seller list. These are commercial money making enterprises my friends.

I also get such books which have published the individual experiences of those who had supposedly died and came back to life. But the individual experience of one

person was different from the other. Please do not get deceived by such things. These are their own subjective reflections of their subconscious mind. It has nothing to with the reality of hereafter life. The Quran has categorically proclaimed that no one can come back to this life after death. If that was the case then there will be total chaos and bickering and fights among people if someone reported that he saw so and so in hell whereas his family thinks he was very pious person and, therefore, you are telling a lie. The person will shoot back that I was there and you weren't and I saw he was in hell. You can very well imagine then where this whole thing will lead to my friends.

We were discussing the behavior of hypocrites and their conspiracies. At present they are contented by conspiring in this way but what will be their state when death faces them and the adverse results of their erroneous deeds overwhelm and crush them? The Quran says: ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اتَّبَعُوا مَا أَسْخَطَ اللَّهَ وَكَرِهُوا رِضْوَانَهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ (47:28). Once again we are forced to comment on the traditional translation of this verse which is: This because they followed that which called forth the Wrath of Allah, and they hated Allah's good pleasure; so He made their deeds of no effect [Yusuf Ali]. What kind of concept of Allah emerges from this translation? – That Allah gets angry and becomes happy like human beings do. But Allah clearly says: سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يَصِفُونَ (37:159) – Allah the Almighty is far above anything which these people ascribe to Him. The correct meaning of this verse is: This is because they follow the path that is against Divine Laws. Living in obedience to the Divine Law is most displeasing to them. Consequently they will not be able to achieve any success and all that they have been doing will go waste.

Psychological disease as the disease of the heart

The Quran says psychological disease is actually a disease of the heart: أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ أَن لَّن يُخْرِجَ اللَّهُ أَضْغَانَهُمْ (47:29) – Do those whose hearts are diseased with hypocrisies expect that Allah will not expose their secret malice and let them live forever under the veil of hypocrisy?

Psychologists tell us that many physical diseases are linked with psychological diseases rooted in subconscious mind. The Quran refers to it as diseases of the heart and says that hypocrites think that they can continue to deceive everyone forever but, in fact, they are deluding themselves.

The position of the Messenger (PBUH)

My dear friends, now comes an extremely important point about the Prophet (PBUH). We have been led to believe by our religious priesthood that whatever the Prophet (PBUH) accomplished in the real world was due to miracles. It was as if he was just a standby and Allah was doing everything for him; His angels we coming wherever they were needed and took care of Prophet's enemies.

Well, let us see how was Allah doing all these things? My dear friends, just imagine what kind of heart-wrenching opposition the Prophet (PBUH) was facing? From inside the hypocrites were making his life unbearable by their mendacity.

(ب) انسانی ذات میں یہ صفات بطور ممکناتِ زندگی مضمر یا خوابیدہ شکل میں ہوتی ہیں۔ان کو مشہود یا بارآور (Actualise) کرنا ہوتا ہے۔

(ج) صفات خداوندی کے جذبات سے بلند، منزا اور مبرا ہونے کے بالمقابل، انسانی صفات میں جذبات کا دخل ہوتا ہے۔شہودِ صفات سے پہلے جذبات پر پورا پورا کنٹرول کرنا لازمی امر ہوتا ہے۔

5- انسانی زندگی کا مقصود یہی ہے کہ ان صفاتِ خداوندی کو معیار بناتے ہوئے ہر ممکن استعداد سے انہیں اپنے اندر منعکس کیا جائے۔جوں جوں انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ہوتی جاتی ہے وہ خدا کا قرب حاصل کرتا ہوا اس کے رنگ (صبغۃ اللہ) میں رنگا جاتا ہے۔اس طرح وہ خدا کے تخلیقی پروگرام میں شریک ہوتا جاتا ہے اور خدا اور بندے کا تعلق رفاقت کا ہو جاتا ہے جس میں بہرحال خدا رفیق اعلیٰ ہوتا ہے۔

6- صفاتِ خداوندی کی انسانی ذات میں نمود سے جوں جوں اس کی نشوونما ہوتی جاتی ہے، یہ اس کے ایمان اور سیرت میں مزید پختگی کا باعث بنتی ہے۔اس طرح وہ ارتقائی مراحل سے گذرتے ہوئے حیات بعد الممات کا امیدوار بننے کے قابل ہو جاتا ہے تاکہ اس مقام کے حصول کے بعد وہ مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کی صلاحیت حاصل کر سکے۔

7- صفاتِ خداوندی متعدد اور متنوع ہونے کے علاوہ بعض مقامات پر، باہمد گر متضاد بھی ہیں۔مثلاً وہ رحیم و کریم بھی ہے اور جبار و قہار بھی۔ذات (کیریکٹر) کے معنی یہ ہیں کہ جس جگہ جس قسم کی صفت کی نمود ضروری ہو وہاں اس صفت کا ظہور ہو اور حسنیٰ کے تحت اس قدر ظہور ہو جس قدر اس موقع پر اس کی ضرورت ہو۔اگر غفور و رحیم کی صفات کے اطلاق ہونے کے مواقع پر قہاریت و جباریت کی صفات کا ظہور ہو جائے تو اس سے نظامِ عالم میں اصلاح کی بجائے فساد برپا ہو سکتا ہے۔

8- انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ایسی شے نہیں جس کے متعلق دوسرے کو کچھ علم ہی نہ ہو سکے۔ان صفات کا اظہار، انسان کی سیرت و کردار میں ہوتا ہے، جو مرئی اور محسوس شکل میں ہر ایک کے سامنے آجاتا ہے۔اسی کو انسان کا کیریکٹر کہتے ہیں۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL. 72
ISSUE
10

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666 E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/
www.youtube.com/idaratolueislam/

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خدائے رحمٰن ورحیم نے اس کتابِ عظیم کو اس لئے نازل کیا ہے کہ اُس نے، اشیائے کائنات اورنوعِ انسان کی نشوونما کی جو ذمہ داری لے رکھی ہے، وہ پوری ہوجائے۔(6:54؛6:12)
یہ نشوونما، وحی کی راہنمائی کے بغیر ممکن نہیں۔(17:82؛10:57۔58)
چونکہ انسانی دنیا میں خدا کی ذمہ داریاں انسانوں کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں، اس لئے خدا کے بندوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس کام کا بھی ارادہ کریں اُس سے مقصد، خدا کے اِس پروگرام کی تکمیل ہو۔(6:163)

